فہرست

شذرات	دہشت گردی ـــــ علما کی اصل ذمہ داری	منظور الحسن	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۲۱۔۲۵)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی	آدم کی جنتی اور جہنمی اولاد	طالب محسن	۹
دین و دانش	قانون عبادات (۱۱)	جاوید احمد غامدی	۱۱
حالات و وقائع	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (۲)	عمار خان ناصر	۲۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

دہشت گردی ـــــ علما کی اصل ذمہ داری

مذہب کے نام پر دہشت گردی کے واقعات روز افزوں ہیں۔ اس دہشت گردی کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہ دینی علوم کی درس گاہوں میں جنم لیتی، مسجدوں اور امام بارگاہوں میں پروان چڑھتی اور پھر متشدد مذہبی تنظیموں کی شکل میں ملک کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے۔ منبروں اور جلسہ گاہوں سے کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں، واجب القتل کے نعرے لگتے ہیں اور مخالف نظریات کو ان کے حاملین سمیت صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے عزائم ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادت گاہیں اللہ کی یاد میں کھڑے ہونے والوں کے لہو سے رنگین ہوتی اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ عام شہری بھی بموں کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

اس اندوہ ناک صورت حال کا ایک بڑا محرک بعض مذہبی علما کا تشدد پسندانہ رویہ ہے۔ فرقہ پرستی، مخالف مکتب فکر کے حاملین کی تکفیر کے فتوے اور ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکنے کے جذبات اس متشدد رویے کا باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری بنیادی طور پر علماے دین پر عائد ہوتی ہے تو اس کی بات کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ بظاہر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دین نے علما پر جو ذمہ داری عائد کی تھی، وہ اس سے نہ صرف دست بردار ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے انحراف کی سطح پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علما پر جو ذمہ داری عائد کی ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ''انذار'' کریں، یعنی آخرت کے عذاب سے خبردار کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''اور سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کام کے لیے نکل کھڑے ہوتے، لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو انذار کرتے، جب (علم حاصل کر لینے کے بعد) اُن کی طرف لوٹتے، اس لیے کہ وہ بچتے۔'' (التوبہ ۹: ۱۲۲)

انذار کی اس عظیم ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ علما لوگوں کو شرک کی آلایشوں سے بچا کر توحید کی صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کریں، انھیں نبوت و رسالت کے حقائق سے آگاہ کریں اور پیغمبر آخر الزماں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے ان کی تربیت کا اہتمام کریں۔ آخرت پر ان کے ایمان کو مستحکم کرنے کی سعی کریں اور انھیں دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں۔ انھیں بتائیں کہ یہ دنیا محض ایک آزمایش گاہ ہے، جسے ایک روز ختم ہو جانا ہے۔ اس دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی ابدی دنیا کے لیے صالح نفوس کو تیار کیا جا سکے، اللہ کی قائم کردہ حدود کا پاس کرنے والوں اور ان کو توڑنے والوں میں امتیاز کیا جا سکے۔ اس کے فرماں برداروں اور اس سے سرکشی کرنے والوں کو الگ الگ کیا جا سکے اور پھر پاک نفس والے مطیع انسانوں سے جنت کو بسایا جائے اور آلودہ نفس والے سرکش انسانوں کو دوزخ کا ایندھن بنا دیا جائے۔ ان حقائق کی مسلسل تذکیر و نصیحت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی جملہ تعلیمات سے لوگوں کو آگاہی علما کی اصل ذمہ داری ہے۔

اس ذمہ داری کو ادا کرتے وقت انھیں اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کا لازماً پاس کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تذکیر و نصیحت اور یاد دہانی ہی تک محدود رکھیں، اس سے آگے بڑھ کر دھونس اور زبردستی کی اللہ تعالیٰ نے کوئی گنجایش نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ گنجایش اگر دینی ہی ہوتی تو ان ہستیوں کو دیتے جو اپنی ذات کے تزکیے میں سب سے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں۔ لوگوں کی اخروی نجات کے لیے جن کی تڑپ بے کراں تھی، جن کی بات بلاغ مبین تھی اور جن سے خدا براہِ راست کلام کرتا تھا، ان برگزیدہ ہستیوں کو تو واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ:

''تم یاد دہانی کیے جاؤ۔ تم بس یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔'' (الغاشیہ ۸۸: ۲۱۔۲۲)

''تم جن کو چاہو انھیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جنھیں چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو ہدایت پانے والے ہیں۔'' (القصص ۲۸: ۵۶)

''تم اگر ان کی ہدایت کے لیے حریص ہو تو اللہ ان کو ہدایت نہیں دیا کرتا، جنھیں وہ (اپنے قانون کے مطابق) گمراہ کر دیتا ہے، اور اس طرح کے لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔'' (النحل ۱۶: ۳۷)

ظاہر ہے کہ اگر انبیا کا کام محض تذکیر و یاد دہانی تک محدود ہے تو ان کی اتباع میں کھڑے علما اس سے آگے کیونکر بڑھ سکتے ہیں، ان کا کام تو بس یہی ہے کہ قرآن و سنت کے پیغام کو اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے لوگوں تک پہنچا دیں۔ ان کی زبان شیریں ہو، ان کا استدلال مضبوط ہو، ان کا انداز خیر خواہانہ ہو، ان کی تنقید شایستہ ہو۔ دعوت کا یہ اسلوب ہی دلوں میں گھر کرتا اور بنجر زمینوں میں بھی روئیدگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اسلوب اختیار کر لینے کے بعد پھر اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ نظریاتی مخالفین کے وجود کو مٹا دیا جائے، بلکہ اگر اللہ کو منظور ہو تو مخالفین کا وجود آہستہ آہستہ ان کے لیے سراپا نصرت و تعاون بن جاتا ہے۔

لیکن یہ شاید پوری امت کا المیہ ہے کہ دین کے علم بردار اپنی اصل ذمہ داری سے گریز پا نظر آتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ دین کی تعلیم و تربیت اور آخرت کی جواب دہی کے لیے لوگوں کو انذار اب ان کا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے لیے جو کام منتخب کیے ہیں، وہ سرتاسر یہی ہیں کہ اپنے نظریاتی مخالفین کے خلاف سادہ لوح لوگوں کو مشتعل کیا جائے۔ ان کی تکفیر کے فتوے صادر کیے جائیں اور انھیں واجب القتل ٹھہرایا جائے۔

اس سارے رویے میں علما، دین کی اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس دنیا میں کسی شخص یا گروہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانونی اعتبار سے مسلمان ہے یا غیر مسلم، لیکن جہاں تک حقیقی ایمان کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ دلوں میں جھانکنے کی نہ ہم صلاحیت رکھتے اور نہ ہمیں اس کی سعی کرنی چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید کی رو سے قانونی اعتبار سے ہر وہ شخص مسلمان قرار پائے گا جو زبان سے اسلام کے عقائد کا اقرار کرتا، نماز قائم کرتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ علما اگر کسی شخص یا گروہ کے نظریات کو غلط سمجھتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ نظریات کی غلطی کو علمی سطح پر واضح کریں اور دردمندانہ تذکیر و نصیحت سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ ان کے لیے صحیح لائحۂ عمل یہی ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(٦)

(گزشتہ سے پیوستہ)

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ، وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ، وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ، فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِيْنَ. ﴿٢٢﴾

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سو اِن لوگوں کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو،[٣٨] یہ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے اور اُس کے پیغمبروں کو ناحق[٣٩] قتل کرتے رہے اور اُنھیں قتل کرتے رہے جو لوگوں میں سے انصاف پر قائم رہنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہی ہیں کہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت، دونوں میں ضائع ہوئے اور اب ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔[٤٠] ٢١۔٢٢

[٣٨] اصل الفاظ ہیں: 'فبشر هم بعذاب اليم'۔ یہ 'ان' کی خبر ہے اور اس پر 'ف' اس لیے آ گئی ہے کہ 'ان' کا اسم اس جملے میں جزا کے مفہوم پر متضمن ہے۔

[٣٩] اس لفظ سے یہاں ایک تو یہود کے اس جرم کی سنگینی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ قتل ناحق اور وہ بھی اگر کسی نبی کا ہو تو اس کی سنگینی کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے حق کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز ہے کہ کوئی پیغمبر بھی اس سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ، يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ، ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ، وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ .﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ، وَغَرَّهُمْ فِي دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا

تم نے دیکھا نہیں[۴۱] اُن لوگوں کو جنھیں اِس کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، اُنھیں اللہ کی اِس کتاب[۴۲] ہی کی طرف بلایا جا رہا ہے کہ اُن کے درمیان (اختلافات کا) فیصلہ کر دے۔ پھر (دیکھا نہیں کہ) اُنھی میں سے ایک گروہ اُس سے منہ پھیر لیتا ہے[۴۳] اور حقیقت یہ ہے کہ یہ منہ پھیر لینے والے لوگ ہی

---

[۴۰] قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی تمام تدبیریں اکارت ہو گئیں اور یہ ذلت و نامرادی کے ساتھ جزیرہ نماے عرب سے اس طرح نکال دیے گئے کہ کوئی ان کا حامی اور مددگار نہ تھا۔

[۴۱] یہ اظہار تعجب کا اسلوب ہے جو عربی زبان میں اس طرح کے موقعوں پر اختیار کیا جاتا ہے۔

[۴۲] یعنی اللہ کی جس کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا، اسی کتاب کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید مراد ہے۔ یہود و نصاریٰ کے صحائف کو اس کا ایک حصہ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے۔ زبور اسی حکمت کی تمہید میں خداوند عالم کی تمجید کا مزمور ہے۔ لیکن قرآن کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہ حکمت اور شریعت، دونوں کے لیے ایک جامع شہ پارۂ ادب کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔ پھر اس کے ساتھ خدا کے آخری پیغمبر کی سرگزشتِ انذار بھی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو وہ ایک صحیفۂ کامل ہے اور تورات و انجیل اور دوسرے الہامی صحائف، درحقیقت اسی کے اوراق ہیں جو اس سے پہلے کی امتوں کو دیے گئے تھے۔

[۴۳] اصل میں 'ثم یتولی فریق منھم' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں اصلی زور 'منھم' کے لفظ پر ہے۔ یعنی تعجب اس بات پر ہے کہ یہ منہ پھیرنے والے لوگ اہل کتاب ہیں جو سزاوار تھے کہ سب سے پہلے کتاب الٰہی کو پہچانتے اور اس پر ایمان لاتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ان لوگوں کے لیے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا، بشرطیکہ انھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں۔ جس کتاب کے ابتدائی ابواب انھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انھوں نے دیکھا ہو جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يَفْتَرُوْنَ.﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ، وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.﴿۲۵﴾

ہیں[۴۴]۔ اِن کے اِس رویے کی وجہ یہ ہے کہ اِن کا کہنا ہے کہ دوزخ کی آگ تو ہمیں بس گنتی کے چند دن ہی چھوئے گی اور (یہ ہے کہ اِس طرح کی) جو باتیں یہ گھڑتے رہے ہیں، اُنھوں نے دین کے معاملے میں اِنھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے[۴۵]۔ لیکن کیا بنے گی اُس وقت جب اِن کو ہم ایک ایسے دن کی پیشی کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں اور (جس میں) ہر شخص کی کمائی کا پورا بدلہ اُسے دے دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ۲۳۔۲۵

کمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں۔ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے۔'' (تدبر قرآن ۲/۶۰)

[۴۴] یہ اہل کتاب کے لیے ملامت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پتھروں میں جونک نہیں لگ سکتی۔ حق سے اعراض ان کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے، اس لیے تمھاری دعوت اگر ان کے لیے موثر نہیں ہو رہی تو اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے، یہ سراسر ان کے فساد طبیعت کا قصور ہے۔

[۴۵] یعنی اس بات پر مطمئن کر دیا ہے کہ ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں، ان کے لیے ہمیشہ کی جہنم نہیں ہے۔ یہ اول تو اس میں ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن کے لیے گناہوں کی سزا پا کر لازماً چھوڑ دیے جائیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک دھوکا ہے جس میں ان کی جھوٹی آرزوؤں نے انھیں مبتلا کر دیا ہے۔

[۴۶] اصل الفاظ ہیں: 'فکیف اذا جمعناھم لیوم لاریب فیہ'۔ ان میں حرف جر کے بعد ایک مضاف ہمارے نزدیک محذوف ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

آدم کی جنتی اور جہنمی اولاد

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۱۹)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عن ابی الدرداء رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: خلق اللّٰہ آدم حین خلقہ. فضرب کتفہ الیمنی فأخرج ذریۃ بیضاء کأنھم الذر. وضرب کتفہ الیسری فأخرج ذریۃ سوداء کأنھم الحمم. فقال للذی فی یمینہ: إلی الجنۃ ولا أبالی. وقال للذی فی کتفہ الیسری: إلی النار ولا أبالی.

''حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے موقع پر جب آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو ان کے دائیں کندھے پر ہاتھ مارا اور سفید ذریت نکالی گویا کہ وہ ذرے ہوں۔ اور بائیں کندھے پر ہاتھ مارا اور کالی ذریت نکالی گویا کہ کوئلے ہوں۔ پھر دائیں کندھے والوں کے بارے میں بتایا کہ یہ جنت کی طرف جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اور بائیں کندھے والوں کے بارے میں بتایا کہ یہ جہنم کی طرف جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔''

لغوی مباحث

حین خلقه: جب اس نے اسے پیدا کیا۔ یہ عربی زبان میں زمانے کی تعیین سے بچنے کے لیے ایک عمدہ اسلوب ہے۔

ذریة بیضاء: سفید ذریت اور کالی ذریت سے مراد گورے اور کالے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا تعلق ان کے اخروی انجام سے ہے۔

و لا أبالی: اور میں پروا نہیں کرتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بے نیاز ہونے کا اظہار ہے۔

معنی

اس روایت کے متون اور معانی کے حوالے سے تفصیلی بحث روایت ۹۵ کے تحت کر چکے ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی روایت کے مباحث ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۳۰۰۱۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۸۱۔ مالک، رقم ۱۳۹۵۔ المستدرک، رقم ۷۴، ۷۵، ۳۲۵۶، ۴۰۰۱۔ ابن حبان، رقم ۳۳۸، ۶۱۶۶۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زکوٰۃ

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ، وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ، وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ ، تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ، هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا. (المزمل ۷۳: ۲۰)

''اور اپنے (شب و روز میں) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (دین و ملت کی ضرورتوں کے لیے) اللہ کو قرض دو، اچھا قرض اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ بھلائی تم آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے ہاں اس سے بہتر اور ثواب میں بڑھ کر پاؤ گے۔''

اس آیت میں اور اس کے علاوہ قرآن کے متعدد مقامات پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اموال میں سے زکوٰۃ ادا کریں۔ نماز کے بعد یہ دوسری اہم ترین عبادت ہے۔ اپنے معبودوں کے لیے پرستش کے جو آداب انسان نے بالعموم اختیار کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں سے ایک حصہ ان کے حضور میں نذر کے طور پر پیش کیا جائے۔ اسے صدقہ، نیاز، نذرانے اور بھینٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں زکوٰۃ کی حیثیت اصلاً یہی ہے اور اسی بنا پر اسے عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے کئی جگہ اس کے لیے لفظ صدقہ استعمال کیا ہے اور وضاحت فرمائی ہے کہ اسے دل کی خستگی اور فروتنی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ، وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ، وَهُمْ رٰكِعُوْنَ. (المائدہ ۵: ۵۵)

''جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اس طرح کہ (اندر سے) جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔''

وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا ، وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ، اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ .
(المومنون ۲۳:۶۰)

''اور وہ لوگ کہ جو کچھ بھی دیتے ہیں، اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل اس خیال سے کانپ رہے ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔''

یہ مال کا حق ہے جو خدا کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں 'واتوا حقہ یوم حصادہ'[۳۲۳] کا حکم اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ اس کے بارے میں عام روایت یہ رہی ہے کہ نذر گزارنے کے بعد اسے معبد سے اٹھا کر اس کے خدام کو دیا جاتا تھا کہ وہ اس سے عبادت کے لیے آنے والوں کی خدمت کریں۔ ہماری شریعت میں یہ طریقہ باقی نہیں رہا۔ اس کی جگہ ہم کو ہدایت کی گئی ہے کہ نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے یہ مال ارباب حل وعقد کے سپرد کر دیا جائے۔ تاہم اس کی حقیقت میں اس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ خدا ہی کے لیے خاص ہے اور اس کے بندے جب اسے ادا کرتے ہیں تو اس کی پزیرائی کا فیصلہ بھی اسی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ فرمایا ہے:

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ ، وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ. (التوبہ ۹:۱۰۴)

''کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ اپنے بندوں سے آپ توبہ قبول کرتا اور ان کے صدقات کی پزیرائی فرماتا ہے۔''

دین میں اس عبادت کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز ہی کی طرح اسے بھی آدمی کے مسلمان سمجھے جانے کی شرائط میں سے قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: 'فان تابوا ، واقاموا الصلوۃ ، واتوا الزکوٰۃ ، فاخوانکم فی الدین'[۳۲۴] (پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہوں گے)۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد ایمان کا دوسرا ثمرہ یہی ہے۔ سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی جو آیات ہم نے اس سے پہلے نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے نقل کی ہیں، ان سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اعمال صالح کی فہرست میں نماز کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ اسی حیثیت سے مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ مشرکین کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے، چنانچہ قیامت میں جواب دہی کے اصلی منکر بھی وہی ہیں:

وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ ، الَّذِیْنَ لَایُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ.
(حم السجدہ ۴۱:۶۔۷)

''بربادی ہے اِن مشرکوں کے لیے، یہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور یہی ہیں جو آخرت کے منکر ہیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی یہ اہمیت اپنے ارشادات میں واضح فرمائی ہے۔

ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جسے اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، اس کا یہ مال اس

۳۲۳؎ الانعام ۶:۱۴۱۔ ''اور اس کی فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔''

۳۲۴؎ التوبہ ۹:۱۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے لیے گنجا سانپ بنا دیا جائے گا جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور قیامت کے دن وہ اس کی گردن میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ اس کی باچھیں پکڑ لے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔[325]

ابوذر غفاری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس اونٹ، گائے اور بکریاں ہیں اور وہ ان کا حق ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن وہ اس طرح اس کے سامنے لائی جائیں گی کہ بہت بڑی اور بہت موٹی ہوں گی۔ اسے وہ اپنے پاؤں سے کچلیں گی اور سینگوں سے ماریں گی۔ پہلی گزر جائے گی تو دوسری اس کی جگہ لے لے گی۔ لوگوں کے مابین فیصلہ ہو جانے تک اس کے ساتھ یہی ہوتا رہے گا۔[326]

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ یہی معاملہ زکوٰۃ کے علاوہ ان تمام حقوق و مطالبات اور مصارف خیر کا بھی ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ، وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ، هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ، فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ. (التوبہ ۹: ۳۴-۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دو، اس دن جب دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی، پھر اُن کی پیشانیاں، اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں اس سے داغی جائیں گی۔ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا تو اب چکھو اس کا مزہ جو تم جمع کرتے رہے ہو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زکوٰۃ کی تاریخ

زکوٰۃ کی تاریخ وہی ہے جو نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی طرح اس کا حکم بھی انبیا علیہم السلام کی شریعت میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو اس کے ادا کرنے کی ہدایت کی تو یہ ان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ دین ابراہیمی کے تمام پیرو اس کے احکام سے پوری طرح واقف تھے۔ قرآن نے اسی بنا پر اسے 'حق معلوم'[327] (ایک متعین حق) سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا یہ پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے اور ضروری اصلاحات کے بعد مسلمانوں میں جاری فرمایا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اپنے گھر والوں کو جس طرح نماز کی تاکید کرتے تھے، اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کی تلقین بھی فرماتے تھے: 'کان یأمر اھلہ بالصلوٰۃ و الزکوٰۃ، و کان عند

---

۳۲۵ بخاری، رقم ۱۳۳۸۔

۳۲۶ بخاری، رقم ۱۳۹۱۔

۳۲۷ المعارج ۷۰: ۲۴۔

ربہ مرضیاً[۳۲۸] ’(وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا اور اپنے پروردگار کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا)۔ بنی اسرائیل کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے نماز اور زکوٰۃ، دونوں کی پابندی کا عہد لیا[۳۲۹]، اور وعدہ فرمایا تھا کہ ’انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ و اٰتیتم الزکوٰۃ[۳۳۰] (میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز پر قائم رہو گے اور زکوٰۃ ادا کرو گے)۔ ان کے جلیل القدر آبا کے متعلق قرآن کا بیان ہے: ’و اوحینا الیھم فعل الخیرٰت و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ[۳۳۱] (اور ہم نے ان کو بھلائی کے کام کرنے، نماز کا اہتمام کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی)۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا ہے: ’و اوصانی بالصلوٰۃ و الزکوٰۃ مادمت حیاً[۳۳۲]‘ (اور اللہ نے مجھے زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا ہے)۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ، وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ، حُنَفَآءَ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ، وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ. (البینہ ۹۸: ۴۔۵)

’’اور (اِن میں سے وہ لوگ) جنھیں (پہلے) کتاب دی گئی، وہ یہ واضح نشانی اپنے پاس آ جانے کے بعد ہی تفرقے میں پڑے۔ اور (اِس میں بھی) انھیں یہی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اطاعت کو اس کے لیے خالص رکھتے ہوئے، پوری یک سوئی کے ساتھ، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور (حقیقت یہ ہے کہ) سیدھی ملت کا دین یہی ہے۔‘‘

بائیبل میں بھی زکوٰۃ کا ذکر اسی طرح ہوا ہے۔

احبار میں ہے:

’’اور زمین کی پیداوار کا سارا عشر، خواہ وہ زمین کے بیج کا ہو یا درخت کے پھل کا ہو، خداوند کا ہے اور خداوند کے لیے پاک ہے۔ اور اگر کوئی اپنے عشر میں سے چھڑانا چاہے تو اس کا پانچواں حصہ اس میں اور ملا کر اسے چھڑائے۔ اور گائے بیل اور بھیڑ بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گزرتا ہو، ان کا عشر، یعنی دس پیچھے ایک ایک جانور خداوند کے لیے پاک ٹھیرے۔‘‘ (۲۷: ۳۰۔۳۱)

گنتی میں ہے:

---

۳۲۸ مریم ۱۹: ۵۵۔

۳۲۹ البقرہ ۲: ۸۳۔

۳۳۰ المائدہ ۵: ۱۲۔

۳۳۱ الانبیاء ۲۱: ۷۳۔

۳۳۲ مریم ۱۹: ۳۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

”اور خداوند نے موسیٰ سے کہا: تو لاویوں سے اتنا کہہ دینا کہ جب تم بنی اسرائیل سے اس عشر کو لو جسے میں نے ان کی طرف سے تمھارا موروثی حصہ کر دیا ہے تو تم اس عشر کا عشر خداوند کے حضور اٹھانے کی قربانی کے لیے گزراننا۔“ (۱۸: ۲۵۔۲۶)

استثنا میں ہے:

”تو اپنے غلے میں سے جو سال بہ سال تیرے کھیتوں میں پیدا ہو، عشر ادا کرنا۔“ (۱۴: ۲۲)

”تین تین برس کے بعد تو تیسرے برس کے مال کا سارا عشر نکال کر اسے اپنے پھاٹکوں کے اندر اکٹھا کرنا۔ تب لاوی جس کا تیرے ساتھ کوئی حصہ یا میراث نہیں اور پردیسی اور یتیم اور بیوہ عورتیں جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہوں، آئیں اور کھا کر سیر ہوں تا کہ خداوند تیرا خدا تیرے سب کاموں میں، جن کو تو ہاتھ لگائے، تجھ کو برکت بخشے۔“ (۱۴: ۲۸۔۲۹)

”اور جب تو تیسرے سال جو عشر کا سال ہے، اپنے سارے مال کا عشر نکال چکے تو اسے لاوی اور مسافر اور یتیم اور بیوہ کو دینا تا کہ وہ اسے تیری بستیوں میں کھائیں اور سیر ہوں۔“ (۲۶: ۱۲)

سیدنا مسیح علیہ السلام نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

”اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر تو عشر دیتے ہو۔ پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں، یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔“ (متی ۲۳: ۲۳۔۲۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زکوٰۃ کا مقصد

زکوٰۃ کا مقصد اس کے نام ہی سے متعین ہو جاتا ہے۔ اس لفظ کی اصل نمو اور طہارت ہے۔ لہٰذا اس سے مراد وہ مال ہے جو پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے کے لیے دیا جائے۔ اس سے واضح ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد وہی ہے جو پورے دین کا ہے۔ یہ نفس کو ان آلایشوں سے پاک کرتی ہے جو مال کی محبت سے اس پر آ سکتی ہیں، مال میں برکت پیدا کرتی ہے اور نفس انسانی کے لیے اس کی پاکیزگی کو بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا چونکہ یہ کم سے کم مطالبہ ہے جسے ایک مسلمان کو ہر حال میں پورا کرنا ہے، اس لیے اس سے وہ سب کچھ تو حاصل نہیں ہوتا جو اس سے آگے انفاق کے عام مطالبات کو پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور جسے ہم اس سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کی بحث میں بیان کر آئے ہیں، تاہم انسان کا دل اس سے بھی اپنے پروردگار سے لگ جاتا اور اللہ تعالیٰ سے وہ غفلت بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے جو دنیا اور اسباب دنیا کے ساتھ تعلق خاطر کی وجہ سے اس پر طاری ہوتی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں: آدمی کا دل وہیں رہتا ہے جہاں اس کا مال رہتا ہے۔[۳۳۳] یہ بات محتاج استدلال نہیں ہے۔ آدمی جب چاہے، اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔

۳۳۳؎ متی ۶: ۲۱۔ لوقا ۱۲: ۳۴۔

زکوٰۃ کا یہ مقصد قرآن مجید نے نہایت خوبی کے ساتھ خود بھی واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا. (التوبہ ۹:۱۰۳)

''ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لو، اس سے تم انھیں پاکیزہ بناؤ گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔''

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ. (الروم ۳۰:۳۹)

''اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو تو اسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھاتے ہیں۔''

زکوٰۃ کا قانون

زکوٰۃ کا قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے سمجھنے میں فقہا کے اختلافات سے قطع نظر کر کے اسے اگر شریعت میں اس کی اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسے ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ پیداوار، تجارت اور کاروبار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب سے کم سرمایے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہو گی اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ اس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲½ فی صدی سالانہ۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اس کا ۱۰ فی صدی، اور اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی، اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔

مواشی میں

۱۔ اونٹ

۵ سے ۲۴ تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری

۲۵ سے ۳۵ تک، ایک یک سالہ اونٹنی اور اگر وہ میسر نہ ہو تو دو سالہ اونٹ

۳۶ سے ۴۵ تک، ایک دو سالہ اونٹنی

۴۶ سے ۶۰ تک، ایک سہ سالہ اونٹنی

۶۱ سے ۷۵ تک، ایک چار سالہ اونٹنی

۷۶ سے ۹۰ تک، دو، دو سالہ اونٹنیاں

۹۱ سے ۱۲۰ تک، دو، سہ سالہ اونٹنیاں

۱۲۰ سے زائد کے لیے ہر ۴۰ ہر ایک دو سالہ اور ہر ۵۰ پر ایک سہ سالہ اونٹنی۔

ب۔ گائیں

ہر ۳۰ پر ایک یک سالہ اور ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ بچھڑا۔

ج۔ بکریاں

۴۰ سے ۱۲۰ تک، ایک بکری

۱۲۱ سے ۲۰۰ تک، دو بکریاں

۲۰۱ سے ۳۰۰ تک، تین بکریاں

۳۰۰ سے زائد میں ہر ۱۰۰ پر ایک بکری۔

۳۔ زکوٰۃ کے مصارف سے متعلق کوئی ابہام نہ تھا۔ یہ ہمیشہ فقرا و مساکین اور نظم اجتماعی کی ضرورتوں ہی کے لیے خرچ کی جاتی تھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب منافقین نے اعتراضات کیے تو قرآن نے انھیں خود پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ ارشاد فرمایا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ، وَالْمَسٰكِيْنِ، وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ، وَفِي الرِّقَابِ، وَالْغٰرِمِيْنَ، وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (التوبہ ۹: ۶۰)

’’یہ صدقات تو بس فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں، اور ان کے لیے جو ان پر عامل بنائے جائیں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، اور اس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے اور تاوان زدوں کی مدد کرنے میں، راہ خدا میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔‘‘

اس آیت میں جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔

’العاملین علیہا‘، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔[۳۳۴]

’المؤلفة قلوبہم‘، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

۳۳۴؎ اس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت ’العاملین علی اخذ الضرائب وردھا الی المصارف‘ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے جو قرآن نے اس مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگ بالعموم اسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، لیکن اس کی جو تالیف ہم نے بیان کی ہے، اس کے لحاظ سے دیکھیے تو اس کا یہ مفہوم بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔

'فی الرقاب'، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

'الغارمین'، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

'فی سبیل اللّٰہ'، یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔

'ابن السبیل'، یعنی مسافروں کی مدد اور ان کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

۴۔ زکوٰۃ کی ایک قسم صدقۂ فطر بھی ہے۔ یہ ایک فرد کے لیے صبح و شام کا کھانا ہے جو چھوٹے بڑے ہر شخص کے لیے دینا لازم کیا گیا ہے اور رمضان کے اختتام پر نماز عید سے پہلے دیا جاتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ لغو اور شہوانی باتوں کے اثرات سے روزوں کی تطہیر اور غریبوں کے لیے عید کے کھانے کی غرض سے عائد کیا ہے۔[۳۳۵] حضور کے زمانے میں اسے بالعموم اناج کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی مقدار ایک صاع، یعنی کم و بیش ڈھائی کلوگرام مقرر کر دی تھی:

فرض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم زکوٰۃ الفطر صاعاً من تمر، او صاعاً من شعیر، علی العبد والحر، والذکر والانثی، والصغیر والکبیر من المسلمین، وامر بھا ان تودی قبل خروج الناس الی الصلوٰۃ۔
(بخاری، رقم ۱۵۰۳)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر ہر مسلمان پر لازم ٹھیرایا ہے، ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر فرد کے لیے، غلام ہو یا آزاد، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا اور حکم دیا ہے کہ یہ نماز کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔''

ریاست زکوٰۃ لے گی تو اس کے دینے والے بھی ہوں اور وصول کرنے والے بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ دینے والے اپنے اوپر زیادتی کے باوجود ان لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کریں جو ان کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آئیں[۳۳۶] اور وصول کرنے والے خیانت نہ کریں،[۳۳۷] زکوٰۃ دینے والوں کو اپنے پاس بلانے کے بجائے ان کی جگہ پر پہنچ کر ان سے زکوٰۃ وصول کریں،[۳۳۸] زکوٰۃ میں ان کا بہترین مال سمیٹ لینے کی کوشش نہ کریں اور مظلوم کی بدعا سے بچیں، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔[۳۳۹]

زکوٰۃ کا قانون یہی ہے۔ تاہم اس معاملے میں عام غلط فہمیوں کے باعث یہ چند باتیں مزید واضح رہنی چاہییں:

---

۳۳۵ ابوداؤد، رقم ۱۶۰۹۔

۳۳۶ مسلم، رقم ۔۹۸۹۔ ابوداؤد، رقم ۱۵۸۹۔

۳۳۷ مسلم، رقم ۱۸۳۳۔

۳۳۸ ابوداؤد، رقم ۱۵۹۱۔

۳۳۹ مسلم، رقم ۱۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک یہ کہ زکوٰۃ کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط ہمارے فقہا نے عائد کی ہے، اس کے لیے کوئی ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے، اس وجہ سے زکوٰۃ جس طرح فرد کے ہاتھ میں دی جا سکتی، اسی طرح اس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے۔[340]

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی ممانعت فرمائی تو اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ تھی کہ اموال فے میں سے ایک حصہ آپ کی اور آپ کے اعزہ واقربا کی ضرورتوں کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔[341] یہ حصہ بعد میں بھی ایک عرصے تک باقی رہا۔ لیکن اس طرح کا کوئی اہتمام، ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اسے کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بنی ہاشم کے فقرا و مساکین کی ضرورتیں بھی زکوٰۃ کے اموال سے اب بغیر کسی تردد کے پوری کی جا سکتی ہیں۔

تیسری یہ کہ ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقصد سے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ نہیں لی اور مال، مواشی اور زرعی پیداوار میں اس کا نصاب مقرر فرمایا۔ یہ نصاب درج ذیل ہے:

مال میں ۵ اوقیہ / ۶۴۲ گرام چاندی

پیداوار میں ۵ وسق / ۶۵۳ کلوگرام کھجور

مواشی میں ۱۵ اونٹ، ۳۰ گائیں اور ۴۰ بکریاں۔

آپ کا ارشاد ہے: 'قد عفوت عن الخیل والرقیق'[342] (میں نے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے)۔ اسی طرح فرمایا ہے:

لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة، ولیس فیما دون خمس اواق من الورق صدقة، ولیس فیما دون خمس ذود من الابل صدقة. (الموطا، رقم ۵۷۸)	''۵ وسق سے کم کھجور میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، ۵ اوقیہ سے کم چاندی میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور ۵ سے کم اونٹوں میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔''

---

[340] اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو، استاذ امام امین احسن اصلاحی کی کتاب ''توضیحات'' میں ان کا مضمون: ''مسئلۂ تملیک''۔

[341] مسلم، رقم ۱۰۶۹، ۱۰۷۲۔

[342] ابوداؤد، رقم ۱۵۷۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چوتھی یہ کہ جو کچھ صنعتیں اس زمانے میں وجود میں لاتیں اور اہل فن اپنے فن کے ذریعے سے پیدا کرتے اور جو کچھ کرایے، فیس اور معاوضۂ خدمات کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، وہ بھی اگر مناط حکم کی رعایت ملحوظ رہے تو پیداوار ہی ہے۔ اس وجہ سے اس کا الحاق اموال تجارت کے بجائے مزروعات سے ہونا چاہیے اور اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس اصول کے مطابق کرایے کے مکان، جائدادیں اور دوسری اشیا اگر کرایے پر اٹھی ہوں تو مزروعات کی اور اگر نہ اٹھی ہوں تو ان پر مال کی زکوٰۃ عائد کرنی چاہیے۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

تنقیدی آرا کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲

چند مزید استدلالات اور ان کا جائزہ

اگرچہ سابقہ بحث کی روشنی میں مسئلے کا بنیادی اور فیصلہ کن پہلو ہمارے نقطۂ نگاہ سے منقح ہو چکا ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کی تکمیل کے لیے ان جزوی اور ثانوی نوعیت کے استدلالات پر بھی یہاں تبصرہ کر دیا جائے جو اس حوالے سے مختلف ناقدین کی جانب سے سامنے آئے ہیں۔

اس ضمن میں واقعۂ اسرا اور تحویل قبلہ کے واقعات کے حوالے سے جو استدلال بالعموم پیش کیا جاتا ہے، اس پر ہم اصل تحریر میں تنقید کر چکے ہیں۔ بعض ناقدین نے اگرچہ ان واقعات کو دوبارہ بطور دلیل پیش کر دیا ہے، لیکن ہمارے اٹھائے ہوئے تنقیدی نکات سے، سردست، کسی ناقد نے تعرض کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے علاوہ جو مزید دلائل و قرائن اس سلسلے میں سامنے آئے ہیں، انھیں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم یہاں زیر بحث لائیں گے:

۱۔ 'تکوینی مشیت' اور 'تشریعی حکم' میں فرق

تورات اور قرآن، دونوں کے بیانات کی رو سے یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ہیکل سلیمانی کی بربادی اور یہود کے اس سے بے دخل کیے جانے کے واقعات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے بنی اسرائیل کی بدکرداری کی پاداش میں رونما ہوئے۔ اس سے

استدلال کرتے ہوئے بعض ناقدین نے یہ کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اہتمام فرمایا ہے کہ یہود اپنے قبلے کی تولیت سے محروم رہیں تو امت مسلمہ انھیں یہ حق کیونکر دے سکتی ہے؟

یہ استدلال اللہ تعالیٰ کی 'تکوینی مشیت' اور 'شرعی حکم' کے مابین اس نازک فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس کا ہم نے اصل تحریر میں اشارتاً ذکر کیا تھا۔ سطور بالا میں ہم اپنے اس نقطۂ نظر کے دلائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کے حق تولیت سے یہود کا محروم کیا جانا سراسر ایک تکوینی معاملہ ہے جسے امت مسلمہ کسی بھی اصول کی رو سے اپنے طرز عمل کا ماخذ نہیں بنا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی 'تکوینی مشیت' اور 'شرعی حکم' کے مابین یہ فرق اہل علم کے ہاں مسلم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کسی گروہ کے مواخذہ کے لیے تکوینی لحاظ سے اس کے ساتھ جو مخصوص معاملہ فرماتے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ شریعت کی واضح ہدایات کے بغیر ہمارے لیے واجب الاتباع نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اس نوعیت کے کسی فیصلے کو اپنے طرز عمل کا ماخذ بنانا شریعت کی رو سے حرمت کے درجے میں ممنوع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید نے بخت نصر اور طیطس کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بندے تھے جنھوں نے اس کی تکوینی مشیت کے تحت مسجد کی بے حرمتی کی، بنی اسرائیل کا قتل عام کیا اور ہر چیز کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ تکوینی مشیت کسی بھی طرح ہمارے لیے شرعی ماخذ نہیں بن سکتی اور نہ کوئی مسلمان اس کی بنیاد پر مسجد اقصیٰ کے ساتھ اس سلوک کو جائز قرار دے سکتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے یہاں جس بات کو اپنی تکوینی مشیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، دوسرے مقام پر اسی طرز عمل کو اختیار کرنے پر نصاریٰ کی مذمت کی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۴ میں یہ ارشاد: 'ومن اظلم ممن منع مساجد اللّٰه ان یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها' نصاریٰ کے اس طرز عمل ہی کے حوالے سے وارد ہوا ہے جو انھوں نے مسجد اقصیٰ کی توہین اور یہود کو اس میں عبادت سے روکنے کے حوالے سے اپنا رکھا تھا۔

یہی معاملہ اس تکوینی حکم کا بھی ہے جس کے نتیجے میں من حیث القوم جلا وطنی، ذلت و رسوائی اور اقوام عالم کے ہاتھوں اذیتیں سہنے کا انجام بنی اسرائیل کے لیے مقدر کر دیا گیا۔ اس کے باوجود کسی شرعی یا اخلاقی جواز کے بغیر محض اس بنیاد پر یہودیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھنا کہ یہ سزا اللہ تعالیٰ نے ان پر نافذ کر رکھی ہے، کسی صاحب علم کے نزدیک درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی پوری تاریخ، بالخصوص اندلس کے عہد حکومت اور خلافت عثمانیہ کے دور میں یورپ کے عیسائیوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہونے والے یہودیوں کو بھرپور مالی اور سیاسی پناہ فراہم کرتے رہے ہیں۔

سرزمین فلسطین پر یہودی ریاست کے قیام کو بھی بہت سے اہل علم نے اسی تناظر میں دیکھتے ہوئے اسے ایک سزا قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی طور پر مسلمانوں پر نافذ کی گئی ہے[۴۸]، لیکن اس کے باوجود وہ نہ قیام اسرائیل کو جائز تسلیم

---

۴۸ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن ۵/۴۵۰۔

کرتے ہیں اور نہ اس بنیاد پر بیت المقدس سے دست برداری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی تکوینی مشیت کو قانونی و شرعی جواز کا ماخذ نہیں سمجھتے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ کی تکوینی مشیت، شرعی حکم کے مترادف نہیں ہوتی اور نہ اس سے کسی طرز عمل کے حق میں جواز اخذ کرنا درست ہے۔ ہمارے لیے ایسے امور میں بھی معیار اور ضابطے کی حیثیت انھی شرعی احکام اور اخلاقی مسلمات کو حاصل ہے جنھیں ہم باقی تمام امور میں اپنے طرز عمل کا ماخذ بناتے ہیں۔

۲۔ 'ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللّٰہ' کی تعمیم

سورۂ برأۃ کی آیت ۱۷ اور ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مشرکین چونکہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں، اس لیے انھیں اللہ کی عبادت کے لیے قائم کردہ مساجد کی تولیت کا کوئی حق نہیں۔ ان کے اعمال اکارت ہیں اور یہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مساجد کی تولیت کا حق ان اہل ایمان کو حاصل ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اقامت صلوٰۃ اور ایتاے زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

بعض ناقدین نے اس آیت کو تمام مساجد کی تولیت کے حوالے سے ایک اصولی اور عمومی حکم قرار دیتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ اس کی رو سے کوئی بھی مسجد ہدایت الٰہی سے منحرف کسی بھی گروہ کے زیر تولیت نہیں رہ سکتی، لیکن اصول استنباط کی روشنی میں یہ استدلال ایک بالکل ناپختہ اور خام استدلال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ حکم اپنے الفاظ اور سیاق و سباق ہی کے لحاظ سے اس سے ابا کرتا ہے کہ اسے کوئی عام حکم قرار دیا جائے۔ آیت کے الفاظ اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ یہاں زیر بحث صرف مشرکین اور مسجد حرام پر ان کا حق تولیت ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے نبیوں کی قائم کردہ مساجد کے حق تولیت کا مسئلہ قرآن مجید میں صرف ایک جگہ یعنی زیر بحث آیت میں بیان نہیں ہوا اور نہ اس آیت کی نوعیت اس حکم کے واحد ماخذ کی ہے۔ قرآن مجید میں ان مساجد کے حق تولیت کی بحث، جیسا کہ ہم پوری تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، ہجرت مدینہ کے بعد ایک مسلسل مضمون کے طور پر بیان ہوئی ہے اور اس بحث میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ محل نزاع صرف مسجد حرام کو قرار دیا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً یہ بات بھی واضح فرما دی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کسی بھی درجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کے مشن کا ہدف نہیں۔ زیر بحث حکم اسی تناظر میں ان احکام کے ضمن میں وارد ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تکمیلی مرحلے میں خاص طور پر صرف مشرکین عرب کے بارے میں دیے گئے، چنانچہ اپنے الفاظ، سیاق و سباق اور پس منظر کے لحاظ سے یہ حکم اس کا متحمل ہی نہیں کہ اس کی تعمیم کر کے یہود اور مسجد اقصیٰ کو اس کے دائرۂ اطلاق میں شامل کیا جا سکے۔

ناقدین کے لیے غلط فہمی کا سبب غالباً یہ بات ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مشرکین کے حق تولیت کی تنسیخ کی علت ان کے 'کفر' کو قرار دیا ہے اور کفر کی علت یہود میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اول تو، جیسا کہ ہم اکابر مفسرین کے حوالے سے واضح کر چکے ہیں، اس آیت میں 'کفر' سے مراد مشرکین کا 'شرک' ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ 'کفر' کا لفظ یہاں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اپنی تمام صورتوں کے لیے عام ہے تو بھی اس نوعیت کے احکام میں ان کے اصل پس منظر کو ملحوظ رکھے بغیر محض کسی ایک آیت کے ظاہری الفاظ پر حکم کے عموم یا خصوص کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو نتیجہ متکلم کے منشا کے صریح منافی نکلے گا۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَلَاتَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ، وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ...اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ. (البقرہ:۲۲۱)	''مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ صاحب ایمان لونڈی بھی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے، اگرچہ اس کا حسن تمھیں لبھائے ... یہ اہل شرک تو جہنم کی آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔''

یہاں مشرک عورت سے حرمت نکاح کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ''مشرکین آگ کی طرف بلاتے ہیں''۔ اگر اس معاملے میں وارد دیگر نصوص کو نظر انداز کر دیا جائے تو آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی غیر مسلم عورت سے، چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو، نکاح جائز نہیں، کیونکہ جہنم کی طرف بلانے کی علت ان میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن جیسا کہ واضح ہے، یہ متکلم کا منشا نہیں ہے اور خود قرآن مجید نے دوسرے مقام پر صراحتاً اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دیا ہے[49]۔ بالکل اسی طریقے سے سورۂ برأۃ کی مذکورہ آیت کے ظاہری الفاظ کی بنیاد پر حق تولیت کی تنسیخ کو مسجد اقصیٰ کے لیے عام قرار دینا علمی لحاظ سے ایک بالکل فاسد استدلال ہے، کیونکہ اس معاملے سے متعلق دیگر نصوص میں، جن کی تفصیلی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں، حق تولیت کے حوالے سے مشرکین اور اہل کتاب کے مابین ایک واضح امتیاز قائم کر دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ برأۃ کا مذکورہ حکم یہود کو مشرکین پر 'قیاس' کرنے کے لیے بھی بنیاد نہیں بن سکتا۔ کسی صریح نص کے بغیر یہود کے حق تولیت کا حکم 'قیاس' کے اصول پر ان نصوص سے اخذ کرنے میں جن میں مشرکین کے حق تولیت کا حکم بیان ہوا ہے، تین باتیں مانع ہیں: ایک یہ کہ حق تولیت کی تنسیخ ایک بے حد نازک اور اہم معاملہ ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے 'نص' کا متقاضی ہے، اس لیے اس بارے میں نص صریح سے کم تر کوئی چیز، خواہ وہ قیاس ہو یا عقلی استدلال کی کوئی اور قسم، قبول نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ قیاس سے رجوع صرف اس معاملے میں کیا جا سکتا ہے جو غیر منصوص ہو، جبکہ زیر بحث مسئلے میں نصوص خاموش نہیں ہیں، بلکہ صریحاً اس تصور کی نفی کرتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس معاملے کو غیر منصوص فرض کر لیا جائے تو بھی مقیس علیہ اور مقیس کے مابین جس نوعیت کی مماثلت قیاس کی بنیاد بن سکتی ہے، وہ زیر بحث صورت میں مفقود ہے اور ملت ابراہیمی سے انحراف کی ظاہری مماثلت سے مذکورہ نتیجہ اخذ کرنا ان دونوں گروہوں اور عبادت گاہوں کے مابین فرق و امتیاز کے ان غیر مبہم (Unmistakable) وجوہ کو نظر انداز کیے بغیر ممکن نہیں جو آل ابراہیم کی تاریخ اور اسلامی شریعت کے قطعی دلائل سے ثابت ہیں اور جن کی پوری تفصیل ہم اوپر کی سطور میں بیان کر چکے ہیں۔

---

[49] المائدہ:۵۔

۳۔ ہیکل پر 'مسجد' کے لفظ کا اطلاق

یہ استدلال بھی سامنے آیا ہے کہ یہودی حضرت سلیمان کی قائم کردہ عبادت گاہ کو 'ہیکل' کہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے 'مسجد' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس کو 'مسجد' قرار دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہود اس پر کوئی حق نہیں رکھتے، اس لیے کہ 'مسجد' کا لفظ صرف مسلمانوں کی عبادت گاہ کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ استدلال بدیہی طور پر غلط ہے، اس لیے کہ 'مسجد' کا لفظ یقیناً اپنے اصطلاحی اور عرفی مفہوم کے لحاظ سے مسلمانوں کی مخصوص عبادت گاہوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن اپنے اصل لغوی مفہوم کے لحاظ سے یہ مطلقاً 'عبادت گاہ' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، چاہے وہ مسلمانوں کی ہو یا اہل کتاب کی۔ قرآن و حدیث میں اس استعمال کے نظائر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۴ میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس طرز عمل کی مذمت کی ہے کہ وہ مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر تعدی کرتے اور عبادت گزاروں کو ان میں جا کر اللہ کو یاد کرنے سے روکتے ہیں۔ یہاں اہل کتاب کی عبادت گاہوں کے لیے 'مساجد اللہ' کا لفظ استعمال ہوا ہے:

وَمَنُ أَظُلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَن يُذُكَرَ فِيهَا اسُمُهُ وَسَعَىٰ فِى خَرَابِهَا .	''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اللہ کا نام یاد کرنے سے روکے اور ان کو ویران کرنے کی سعی کرے۔''

سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا، جو مسیحی مذہب کے پیروکار تھے، ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے ہم مذہب لوگوں نے ان کی یاد میں ایک عبادت گاہ تعمیر کر لی۔ یہاں گرجے کے لیے 'مسجد' کا لفظ استعمال ہوا ہے:

قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمُرِهِمُ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيُهِم مَّسُجِدًا. (۱۸:۲۱)	''جو لوگ ان کے معاملے میں غالب آ گئے، انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کی نسبت سے اس جگہ پر ایک عبادت گاہ قائم کریں گے۔''

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنھا نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان گرجوں کا اور ان میں موجود تصویروں کا تذکرہ کیا جو انھوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصویروں کا پس منظر واضح کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ:

ان اولئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بنوا على قبره مسجدا وصوروا فيه تلك الصور. (بخاری، الصلاۃ، رقم ۴۰۹)	''ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو یہ اس کی قبر پر عبادت گاہ تعمیر کر لیتے اور اس میں ان کی یہ تصویریں سجا لیتے (جو تم نے دیکھی ہیں)۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

یہاں بھی دیکھ لیجیے، نصاریٰ کی عبادت گاہوں کے لیے 'مسجد' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب اگر ہیکل سلیمانی کو 'مسجد' کے نام سے ذکر کرنا یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کی دلیل ہے تو اہل کتاب کی باقی تمام عبادت گاہوں سے بھی ان کا حق تولیت اسی بنیاد پر منسوخ قرار پانا چاہیے، حالانکہ کوئی شخص اس کا قائل نہیں۔

۴۔ بیت المقدس میں یہود کا قیام

فتح بیت المقدس کے موقع پر سیدنا عمر اور اہل بیت المقدس کے مابین جو معاہدہ طے پایا، اس میں یہ شرط شامل تھی کہ:

ولا یسکن بایلیاء معھم احد من الیھود. ''بیت المقدس کے مسیحی باشندوں کے مابین کسی یہودی کو قیام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔''

(طبری، الکامل فی التاریخ ۳/۶۰۹)

اس سے بعض ناقدین نے یہ استدلال کیا ہے کہ جب یہودیوں کو اس شہر میں رہنے تک کی اجازت نہیں تو ہیکل کی تعمیر نو یا احاطۂ ہیکل کے حق تولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن غور کیجیے تو یہ شرط سرے سے زیر بحث نکتے سے متعلق ہی نہیں۔ اہل تاریخ بتاتے ہیں کہ دراصل یہودیوں کے اس شہر میں ٹھہرنے پر پابندی رومی شہنشاہ ہیڈرین نے دوسری صدی عیسوی میں عائد کی تھی جسے بعد میں مسیحیوں نے بھی برقرار رکھا۔ یروشلم کے مسیحی بطریق نے مسلمان فاتحین سے اسی قدیم شرط کو برقرار رکھنے کی درخواست کی تھی جسے منظور کر لیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس شرط کے پس منظر میں مسجد کی تولیت کا معاملہ نہیں تھا، کیونکہ نصاریٰ نہ خود اس مسجد کی تولیت کے مدعی تھے اور نہ انھیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کی تولیت کی ذمہ داری یہود کے بجائے مسلمان سنبھالیں۔ علاوہ ازیں تاریخی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ یہ کوئی لازمی اور بے لچک شرط نہیں تھی اور نہ اس پر عمل درآمد میں کسی قسم کی کوئی سختی روا رکھی گئی۔ خود سیدنا عمر نے طبریہ کے ستر یہودی خاندانوں کو یروشلم میں آ کر آباد ہونے اور احاطۂ ہیکل سے بالکل متصل ایک جگہ پر رہایش اختیار کرنے کی اجازت دی۔[۵۰]

مورخین بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے صدیوں سے عائد پابندی کے بعد پہلی مرتبہ یہودیوں کو اس شہر میں رہنے کی اجازت دی۔ 'دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلی جن' میں لکھا ہے:

''۶۳۸ء کے بعد کچھ یہودی بھی یروشلم میں آ کر بسنے لگے، کیونکہ مسلمانوں نے انھیں اس شہر میں، جہاں ان کا رہنا پانچ صدیوں سے ممنوع چلا آ رہا تھا، دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ یہودی بڑے اشتیاق کے ساتھ یہاں آئے اور انھوں نے اپنی مذہبی تعلیم کا مرکزی مدرسہ بھی طبریہ سے یروشلم میں منتقل کر لیا۔ غالباً وہ احاطۂ ہیکل میں کسی جگہ پر دعا اور عبادت بھی کیا کرتے تھے۔'' (The Encyclopedia of Religion, article:"Jerusalem", 8/12.1987)

۵۰- Encyclopaedia Judaica, "Jerusalem", vol. 9, p. 1410 (Karen Armstrong, "The Holiness of Jerusalem", Journal of Palestine Studies, Vol. XXVII, Number 3, Spring 1998, p. 15) www.jstor.org۔

اموی خلیفہ عبدالملک نے ساتویں صدی میں قبۃ الصخرہ تعمیر کرایا تو اس کی تعمیر اور انتظام وانصرام کے لیے دس یہودی خاندانوں کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ بعد میں عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں انھیں یہاں سے نکال دیا۔[۵۱]

صلیبی جنگوں کے دور میں بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے ظلم وستم کا شکار ہونے والے یہودیوں کو یہاں آباد ہونے کی دعوت دی اور بہت سے یہودی یہاں آ کر رہنے لگے۔[۵۲]

خلافت عثمانیہ کے دور میں بھی اسپین کی مسیحی حکومت کی ایذا رسانی سے بھاگنے والے بہت سے یہودیوں کو یروشلم میں بسایا گیا۔[۵۳]

اس تفصیل سے واضح ہے کہ معاہدۂ بیت المقدس کی مذکورہ شرط محض وقتی نوعیت کی ایک سیاسی شرط تھی جس کا نہ مسجد اقصیٰ کی تولیت سے کوئی تعلق تھا اور نہ اسلامی تاریخ میں اس پر عمل درآمد کو لازم ہی سمجھا گیا۔ چنانچہ میثاق عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یاسر عرفات کا درج ذیل دعویٰ بھی، جو انھوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک نشریاتی خطاب میں کیا، دوسرے بہت سے دعووں کی طرح تاریخی لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہے:

''میثاق عمر کے مطابق (جو عمر اور صفرونیوس کے مابین طے پایا تھا) ایک شرط ایسی تھی جو تمام مسیحیوں نے مسلمانوں کے لیے مانی تھی، یعنی یہ کہ یروشلم میں کوئی یہودی کسی صورت میں نہیں رہے گا۔ یہ معاہدہ ۱۹۱۷ء میں برطانوی انتداب کے آغاز سے پہلے تک نافذ العمل رہا۔''

(Middle East Digest, February 1997, http://christianactionforisrael.org/)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۔ 'شروط عمریہ' سے استدلال

محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے مسجد اقصیٰ کی تولیت کے معاملے میں امت مسلمہ کے فقہی اور آئینی موقف کی بنیاد 'شروط عمریہ' کو قرار دیا ہے۔ 'شروط عمریہ' سے مراد وہ شرائط ہیں جن کے مطابق، مبینہ طور پر، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بازنطینی سلطنت کے مختلف صوبوں اور شہروں کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے مسیحی باشندوں سے معاہدے کیے تھے۔[۵۴] ان شروط کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ واضح رہنی چاہیے کہ اگرچہ دور متوسط کے فقہا اور مورخین ان شروط کو بالعموم مستند تسلیم کرتے اور کلاسیکل فقہی لٹریچر میں ان شرائط کو اہل ذمہ کے حقوق وفرائض اور ان پر لازم پابندیوں کے حوالے سے معیار مانا

۵۱؎ قاضی مجیرالدین الحنبلی، الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل ۲۸۱۔ ۲۸۲۔

۵۲؎ منشی عبدالقدیر، بیت المقدس ۹۰۔ پندرہ روزہ تعمیر حیات، ۱۰ جون ۲۰۰۳ء، ۲۱۔ (http://www.rabbiwein.com/)

۵۳؎ منشی عبدالقدیر، بیت المقدس ۹۲۔

۵۴؎ ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابو یوسف، کتاب الخراج ۱۴۸۔۱۶۱۔ ابن قدامہ، المغنی ۹/ ۲۸۲۔ بیہقی، السنن الکبریٰ ۹/ ۲۰۲۔

جاتا ہے[۵۵]، لیکن بہت سے معاصر ناقدین نے ان کے تاریخی ثبوت اور استناد کو ٹھوس شواہد کی بنیاد پر چیلنج کیا ہے۔ ان کی بنائے استدلال متعدد امور ہیں:

ایک یہ کہ یہ شرائط جن سندوں سے مروی ہیں، وہ تمام کی تمام منقطع اور ضعیف ہیں۔

دوسری یہ کہ ابتدائی دور کے مستند ماخذوں میں ان شروط کا تذکرہ اس شکل میں بالکل نہیں ملتا۔

تیسری یہ کہ ان شروط کے متن میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ، مثلاً 'زنار' کا لفظ، سیدنا عمر کے عہد میں عربی زبان میں مستعمل ہی نہیں تھے۔

چوتھی یہ کہ ان میں سے بیشتر شرائط اہل کتاب کے ساتھ مسامحت اور رواداری کے اس رویے کے بالکل منافی ہیں جو دور صحابہ میں ان کے ساتھ عمومی طور پر اختیار کیا گیا۔

بہت سے مستشرقین نے بھی، جو بالعموم اسلامی تاریخ کا مطالعہ معاندانہ نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، اسی بنیاد پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ان شرائط کی نسبت کے درست ہونے میں شک وشبہے کا اظہار کیا ہے[۵۶]۔

جہاں تک زیر بحث مسئلے میں 'شروط عمریہ' سے استدلال کا تعلق ہے تو کم از کم ہمارا ناقص فہم ان میں کسی معقول بنائے استدلال کا سراغ نہیں لگا سکا۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ ان شروط میں مسجد اقصیٰ کی تولیت کا معاملہ صراحتاً کہیں زیر بحث نہیں آیا۔ اس لیے غالباً ڈاکٹر صاحب ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ مخصوص دفعات سے مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حکم 'استنباط' کرنا چاہتے ہیں۔ بہت غور کرنے اور طائر تخیل کو پرواز کی پوری آزادی دینے کے بعد ہمیں ان شروط میں صرف ایک بات ایسی محسوس ہوئی ہے جس سے ممکنہ طور پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ سیدنا عمر کے زمانے میں جب الجزیرہ کا علاقہ فتح ہوا تو دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کے لوگوں اور مسلمان فاتحین کے مابین بھی صلح کا ایک معاہدہ ہوا۔ فقہ اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں اس معاہدے کی تفصیلات منقول ہیں اور ان میں سے ایک دفعہ یہ ہے کہ:

ولا نجدد ما خرب من کنائسنا. ''ہم اپنے برباد/منہدم ہو جانے والے کلیساؤں میں سے کسی کو از سر نو تعمیر نہیں کریں گے۔''

اس شرط سے استدلال، غالباً، یوں ہے کہ چونکہ یہودیوں کا ہیکل صدیاں پہلے تباہ و برباد ہو چکا ہے، اس لیے اب انھیں اس کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

---

۵۵ ابن القیم: 'احکام اہل الذمۃ'، ۳/ ۱۱۶۴-۱۱۶۵۔

۵۶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد حسین ہیکل، 'الفاروق عمر'، ۱/ ۲۴۱-۲۴۲۔ الدکتور توفیق سلطان الیوزبکی، 'تاریخ اہل الذمۃ فی العراق'، ۱۲۷-۱۳۷۔ سیدۃ اسماعیل کاشف، 'مصر الاسلامیۃ واہل الذمۃ' ۳۹-۴۹۔ ابن القیم، 'احکام اہل الذمۃ'، ۳/ ۱۱۶۳-۱۱۶۴ ہامش۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دعوت اسلام ۶۱۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا، آرٹیکل 'Omar I'۔ منشی عبدالقدیر، بیت المقدس ۶۲۔

ہمارے نزدیک اس استدلال کے بے جواز ہونے کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

شروط عمریہ کے استناد کے بارے میں محققین کے عمومی تحفظات کا تو ہم اختصاراً تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں بالخصوص زیر بحث شرط کے حوالے سے تاریخی مواد کا جائزہ لیجیے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام کے ملکی قانون پر تصنیف کیے جانے والے اولین مآخذ، جن میں دور خلافت راشدہ اور بالخصوص سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اہل ذمہ پر عائد کردہ شروط پر باقاعدہ بحث کی گئی ہے، اس شرط کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ مثال کے طور پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں 'فصل فی الکنائس و البیع و الصلبان' میں مختلف معاہدوں کے متن نقل کیے ہیں اوران شرائط کی تفصیلاً وضاحت کی ہے جو اہل ذمہ پر ان کی عبادت گاہوں اور مذہبی شعائر کے حوالے سے نافذ کی گئیں، لیکن اس ساری بحث میں مذکورہ شرط کا کوئی ذکر نہیں۔[۵۷] امام محمد رحمہ اللہ نے 'السیر الکبیر' میں عبادت گاہوں اور مذہبی شعائر کے حوالے سے اہل ذمہ کے حقوق اور ذمہ داریوں پر ایک مستقل باب میں بالتفصیل بحث کی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ اس شرط کا کوئی تذکرہ نہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ:

فان انھدمت کنیسة من کنائسھم القدیمة فلھم ان یبنوھا کما کانت. (سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱۵۳۵)

''اگر ان کی پرانی عبادت گاہوں میں سے کوئی منہدم ہو جائے تو انھیں پہلے کی طرح اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا حق حاصل ہے۔''

امام ابوعبید رحمہ اللہ نے کتاب الاموال میں 'باب الشروط التی اشترطت علیٰ اھل الذمة حین صولحوا و اقروا علی دینھم' کے تحت سیدنا عمر کی عائد کردہ ان شروط کا باقاعدہ تذکرہ کیا ہے، لیکن ان میں بھی اس شرط کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔[۵۸] یہی وجہ ہے کہ فقہا کے ہاں بھی یہ شرط متفق علیہ نہیں، بلکہ مختلف فیہ ہے۔ بعض شافعی اور حنبلی فقہا اگرچہ اس شرط پر عمل درآمد کے قائل ہیں،[۵۹] لیکن امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ایک رائے کے مطابق امام احمد اس قسم کی کوئی شرط اہل ذمہ پر عائد نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اہل ذمہ کو اپنی جزوی یا کلی طور پر منہدم ہو جانے والی عبادت گاہوں کی مرمت اور تعمیر نو کا پورا پورا حق حاصل ہے۔[۶۰]

تاہم، بر سبیل تنزل، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ شرط سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ اس کے باوجود اس سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کی ممانعت پر استدلال کسی طرح بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۵۷؎ الخراج ۱۴۸۔۱۶۱۔

۵۸؎ الاموال ۱۴۵۔

۵۹؎ کشاف القناع ۳/ ۱۳۳۔

۶۰؎ ابن قدامة، المغنی ۹/ ۲۸۴۔ ماوردی، الاحکام السلطانیة ۱۸۶۔ مغنی المحتاج ۶/ ۷۸۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱۵۳۵۔

۶۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر سیدنا عمر کا طرز عمل

ایک استدلال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے جو انھوں نے فتح بیت المقدس کے موقع پر مسجد اقصیٰ کے معاملے میں اختیار کیا۔ سیدنا عمر جب یہاں تشریف لائے تو سب سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں۔ اگلے روز آپ نے صحابہ کی معیت میں یہاں فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد کعب الاحبار سے دریافت کیا کہ صخرہ، جسے یہود کے قبلے کی حیثیت حاصل ہے، کس جگہ پر واقع ہے؟ کعب نے پیمایش کر کے اس کی جگہ متعین کی۔ اس جگہ کو نصاریٰ نے یہودیوں کے ساتھ اظہار نفرت کے لیے مزبلہ (Garbage Dump) میں تبدیل کر رکھا تھا۔ سیدنا عمر نے گندگی کو وہاں سے ہٹا کر صخرہ کو پاک صاف کرنے کا حکم دیا اور خود بھی اس کی صفائی میں شریک ہوئے۔ پھر آپ نے کعب سے مشورہ طلب کیا کہ مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لیے کون سی جگہ منتخب کی جائے؟ کعب نے کہا کہ نماز صخرہ کے پیچھے ادا کی جائے تاکہ بنی اسرائیل اور امت محمدیہ دونوں کے قبلوں کی تعظیم ہو جائے۔ سیدنا عمر نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا:

''''اے ابو اسحاق، تم پر ابھی یہودیت کے اثرات باقی ہیں۔ مسجد کی بہترین جگہ اس کا اگلا حصہ ہوتی ہے۔'' اس کے بعد آپ نے مسجد کے اگلے حصے میں یعنی جنوبی دیوار کے قریب ایک جگہ کو مسلمانوں کی نماز کے لیے متعین کر دیا۔''

(ابو عبید، الاموال ۱۵۴۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۷/۵۵۔۵۸)

اس طرز عمل سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اگر سیدنا عمر مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق کو باقی سمجھتے تو کلیساے قمامہ اور کلیساے قسطنطین کی طرح یہاں بھی نماز ادا نہ کرتے۔ ان کا یہاں نماز ادا کرنا اور ان کی اتباع میں مسلمانوں کا اس میں سلسلۂ عبادت کو جاری کرنا ناقدین کی رائے میں گویا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یہود کا کوئی حق اس پر تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اس استدلال کو درست تسلیم کرنے میں پہلا مانع تو یہ ہے کہ سیدنا عمر کے طرز عمل کو حق تولیت کی تنسیخ کا قرینہ قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس تصور کی بنیاد قرآن وسنت میں ثابت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی عبادت گاہ کے حق تولیت کی تنسیخ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ہی کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے، سیدنا عمر کسی شرعی بنیاد کے بغیر از خود یہ فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اگر قرآن وسنت سے اس تصور کا کوئی ثبوت نہیں ملتا تو پھر سیدنا عمر کے طرز عمل کی توجیہ بھی اس سے مختلف کرنی ہوگی جو ہمارے ناقدین نے کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا عمر نے جو طرز عمل اختیار فرمایا، وہ داخلی شواہد کے لحاظ سے تمام تر تنسیخ تولیت کے تصور کی نفی کرتا ہے نہ کہ اس کی تائید۔ ان کے اس طرز عمل کی معنویت کو درست طور پر سمجھنے کے لیے تین پہلو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں:

ایک یہ کہ جو عبادت گاہیں اللہ کے پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ جگہوں پر اس کی ہدایات کے مطابق تعمیر فرمائی ہیں، ان کی اصل بنیادوں اور حدود کو، عام انسانوں کی قائم کردہ عبادت گاہوں کے برخلاف، ایک خاص شرعی تقدس حاصل ہے اور

اسی بنیاد پر ان کی حفاظت کا اہتمام لازمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'بیت اللہ' کی حیثیت اصلاً اسی حصے کو حاصل ہے جس کو بانیوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ضرورت کے تحت مزید رقبے کا اضافہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن بعد میں شامل کیا جانے والا تمام تر رقبہ اصل مسجد کے ساتھ اتصال کی وجہ سے محض توسیعاً اور ضمناً مسجد کے حکم میں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے جن اصل بنیادوں پر کعبۃ اللہ کو تعمیر کیا تھا، ان کو بیت اللہ کی پوری تاریخ میں نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ کو بھی چونکہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ جگہ پر الٰہی ہدایات کے مطابق تعمیر کیا تھا، اس لیے اس کی اصل بنیادوں کی حفاظت کا معاملہ بھی، ظاہر ہے، اس سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہود کے حق تولیت کے امت مسلمہ کو منتقل ہونے کے تصور کو درست مان لیا جائے تو سیدنا عمر کو اس عبادت گاہ پر تصرف حاصل کرنے کے بعد اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے تھا کہ جس طرح انھوں نے کعب الاحبار کی رہنمائی میں صخرۂ بیت المقدس کو کوڑا کرکٹ اور ملبے کے نیچے سے دریافت کیا، اسی طرح 'مسجد' کی اصل بنیادوں کو تلاش کر کے ان کو محفوظ کرنے کا انتظام فرماتے، لیکن اس طرح کی کوئی کوشش انھوں نے نہیں کی، چنانچہ اصل مسجد کا رقبہ اور اس کی بنیادیں متعین طور پر آج بھی معلوم نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے اس پورے احاطے کو، جو سارے کا سارا مسجد کا درجہ رکھتا تھا اور جس میں کسی بھی جگہ نماز ادا کی جا سکتی تھی، مسلمانوں کی عبادت کے لیے کھلا چھوڑ دینے کے بجائے اس میں ایک جگہ نماز کے لیے مخصوص کر دی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ساری عبادت گاہ حق تولیت کی منتقلی کے بعد مسلمانوں ہی کا حق بن چکی تھی تو اب وہ اس میں جہاں چاہتے، نماز ادا کرتے اور جس حصے میں چاہتے، عمارت کھڑی کر لیتے۔ پورے احاطے میں ایک مقام کو مخصوص کر دینے کا فائدہ اور حکمت آخر کیا تھی؟

تیسرے یہ کہ کعب الاحبار کی رہنمائی میں جب انھوں نے صخرہ کو، جسے یہود کے قبلے کی حیثیت حاصل تھی، دریافت فرما لیا تو اصل مسجد کا محل وقوع ان کے علم میں آ گیا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ کعب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس مقام کو نماز اور عبادت کے لیے منتخب فرماتے، اس لیے کہ اصل مسجد کی حیثیت اسی حصے کو حاصل تھی، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے ایک ایسی جگہ مخصوص فرمائی جو ہیکل کی چار دیواری کے اندر، لیکن اس کی اصل عمارت سے بالکل ہٹ کر ہے۔ اس کی وہ وجہ بھی یقیناً درست ہے جو روایات میں ان سے منقول ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ سیدنا عمر کی اس فراست اور دور بینی کی ایک اور مثال ہے جس کا اظہار انھوں نے کلیساے قمامہ میں نماز کا وقت آنے پر کیا تھا۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجیے تو سیدنا عمر کا یہ طرز عمل یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کی دلیل نہیں، بلکہ اس بات کا ثبوت قرار پاتا ہے کہ وہ عبادت گاہ پر یہود کے حق کو برقرار مانتے تھے، البتہ انھوں نے اپنے نہایت حکیمانہ فیصلے کے ذریعے سے یہود کے حق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دو مزید مقاصد بھی حاصل کر لیے: ایک یہ کہ اس قدر فضیلت رکھنے والی عبادت گاہ کو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آباد کرنے کی سبیل پیدا کر دی جس میں صدیوں سے خداے واحد کی عبادت کا سلسلہ منقطع تھا، اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے یہاں عبادت کرنے کے حق کو بھی اس طرح سے محفوظ کر دیا کہ مستقبل میں کسی بھی موقع پر یہود کے حق کے ساتھ تعارض پیدا ہونے اور نزاع کھڑی ہونے کی نوبت نہ آئے۔ ہم آیندہ سطور میں واضح کریں گے کہ سیدنا عمر کی یہی وہ فراست ہے جو آج چودہ صدیوں کے بعد بھی دنیا کے اس سنگین ترین مذہبی تنازع کے حل کے لیے ایک معقول اور قابل قبول بنیاد فراہم کرتی ہے، بلکہ اگر عبدالملک بن مروان نے سیدنا عمر کے طے کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہوئے 'قبۃ الصخرۃ' کو تعمیر کر کے عاقبت نا اندیشی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو غالب امکان یہ ہے کہ یہ نزاع سرے سے پیدا ہی نہ ہوتی۔

۷۔ 'مسجد' محل کا نام ہے یا عمارت کا؟

اس ضمن میں ایک اچھوتا نکتہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ یہود کو تولیت کا حق تو صرف اس عمارت پر حاصل تھا جو کہ 'ہیکل' کے نام سے بنی اسرائیل کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ عمارت جس قطعہ زمین پر قائم کی گئی، وہ چونکہ حق تولیت میں شامل ہی نہیں تھا، اس لیے عمارت کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد حق تولیت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

اس استدلال کی سطحیت کو واضح کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ انھی ناقدین نے واقعۂ اسرا کو مسلمانوں کے حق تولیت کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ اس وقت یہاں کوئی عمارت، خاص طور پر مسلمانوں کی تعمیر کردہ کوئی عمارت موجود نہیں تھی۔ اگر حق تولیت کا تعلق صرف عمارت سے ہوتا ہے تو پھر وہ کون سی چیز تھی جس کا حق تولیت واقعۂ اسرا کے موقع پر امت مسلمہ کو عطا کیا گیا؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز استدلال ہے۔ دنیا کے مذاہب میں اس تصور کا ثبوت شاید ہی کہیں پیش کیا جا سکے کہ عبادت گاہ اصل میں عمارت کا نام ہے، نہ کہ اس قطعہ زمین کا جس پر وہ قائم ہے۔ کم از کم یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہبی قوانین میں یہ ایک بالکل اجنبی تصور ہے۔ مولانا قاری محمد طیب اس حوالے سے اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کعبہ کی طرح اقصیٰ بھی درحقیقت فضا کی ایک جہت خاص ہے، کوئی حسی یا جسمانی مکان نہیں ہے۔ رہی عمارت کعبہ یا عمارت اقصیٰ، وہ ان وضعوں پر بطور حسی اور علامتی نشانات کے بنائے گئے ہیں جن کے اندر فضا کی یہ خاص جہت آئی ہوئی ہے۔'' (مقامات مقدسہ ۱۲۵)

''کعبہ کی طرح اقصیٰ بھی اسی محل و مقام کا نام ہوگا جس پر مسجد اقصیٰ کی عمارت بنی کھڑی ہے۔ اگر اس مسجد کی عمارت کسی وجہ سے باقی نہ رہے تو اقصیٰ کے وجود و برکات میں کوئی فرق نہ آئے گا، جبکہ وہ حصہ فضا ہے، عمارت نہیں۔'' (ایضاً ۱۵۱)

جب عبادت گاہ عمارت کے بجائے دراصل اس مخصوص قطعے کا نام ہے جس پر عمارت قائم ہے تو ظاہر ہے کہ حق تولیت کا تعلق بھی قطعہ زمین ہی سے ہوگا۔ سرخسی رحمہ اللہ نے اہل کتاب کی منہدم ہو جانے والی عبادت گاہوں کی تعمیر نو کا حق اسی بنیاد پر ان کے لیے تسلیم کیا ہے:

فـان انهـدمـت كـنيسة مـن كنـائسهم القـديمة فلهم ان يبنوها كما كانت لان حـقهم فى هذه البقعة قد كان مقررا لما كـانـوا اعـدوه لـه فلا يتغير ذلك بانهدام البنـاء فـاذا بـنوه كما كان فالبناء الثانى مثل الاول. (سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱۵۳۵)

''اگر ان کی پرانی عبادت گاہوں میں سے کوئی منہدم ہو جائے تو انھیں پہلے کی طرح اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ اس قطعۂ زمین پر حق تو انھیں اسی لیے حاصل تھا کہ وہ اس پر عبادت گاہ قائم کریں، چنانچہ عمارت کے گرنے سے یہ حق ساقط نہیں ہوگا ، بلکہ اگر وہ اسے دوبارہ تعمیر کریں گے تو اس کا حکم وہی ہوگا جو پہلی عمارت کا تھا۔''

۸۔'جزاء سيئة سيئة مثلها' کا اصول

عالم عرب کے حالیہ رویے کا جواز ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال بھی سامنے آیا ہے کہ چونکہ یہودیوں نے فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطحوں پر ظلم وستم، ناانصافی اور حق تلفی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس لیے اصولی طور پر وہ احاطۂ ہیکل پر کوئی حق رکھتے بھی ہوں تو انھیں عملاً اس سے محروم رکھنا 'Tit for Tat' یا 'جـزاء سيـئة سيـئة مثلها' کے اصول پر جائز ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر امت مسلمہ کے طرز عمل کا ماخذ سیکولر اخلاقیات ہیں تو ممکن ہے ان کی روشنی میں یہ استدلال اپنے اندر کوئی وزن رکھتا ہو، لیکن جہاں تک ان اخلاقی تعلیمات کا تعلق ہے جو عبادت گاہوں کے حوالے سے قرآن مجید نے بیان کی ہیں، تو ان میں اس استدلال کے لیے ذرہ برابر بھی گنجایش نہیں۔ قرآن مجید نہ صرف یہ کہ مذہبی و سیاسی اختلافات کی بنا پر لوگوں کو ان کی عبادت گاہوں میں عبادت سے روکنے کو ایک بہت بڑا ظلم قرار دیتا ہے،[61] بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کو کسی عبادت گاہ سے روکنے کے جرم کا مرتکب ہوا ہو تب بھی دوسرے گروہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ جوابی کارروائی کے طور پر پہلے گروہ کو اس عبادت گاہ میں جانے سے روکے۔ چنانچہ مشرکین عرب کے بارے میں یہ بات آغاز ہی سے مسلمانوں پر واضح کی جا چکی تھی کہ وہ مسجد حرام کی تولیت کے حق دار نہیں۔ اس کے باوجود جب انھوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکا اور یہ خدشہ پیدا ہوا کہ مسلمان بھی جواب میں ان کے عازمین حج کو مکہ مکرمہ جانے سے روکنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ایک واضح اخلاقی اصول کی روشنی میں ان کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

يَـاَ يُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْىَ وَلَا الْقَلَآئِدَ

''ایمان والو، اللہ کے شعائر اور حرام مہینوں اور قربانی کے جانوروں اور ان کے پٹوں اور بیت الحرام کا قصد کرنے

---

۶۱ البقرہ: ۱۱۴۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ. (المائدہ ۵: ۲)

والوں کی بے حرمتی نہ کرو جو اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اور جب تم احرام سے نکل آؤ تو شکار کر سکتے ہو۔ اور اگر کسی گروہ نے تمھیں مسجد حرام سے روکا ہے تو ان کے ساتھ دشمنی تمھیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم بھی ان کے ساتھ زیادتی کرو۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تو ایک دوسرے کی مدد کرو، لیکن گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ نہایت سخت سزا دینے والا ہے۔''

۹۔ قانونی اور اخلاقی حق میں فرق

متعدد ناقدین کے لیے ہماری یہ بات بھی اچنبھے کا باعث بنی ہے کہ احاطۂ ہیکل کی تولیت کے واقعاتی تسلسل کی بنیاد پر اگرچہ امت مسلمہ بلاشرکت غیرے اس عبادت گاہ کی مالک ہونے کے دعوے میں قانونی طور پر حق بجانب ہے، لیکن اخلاقی لحاظ سے اس کا یہ موقف درست نہیں۔ ناقدین کا خیال یہ ہے کہ کسی معاملے کے قانونی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس طرح کی کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ گویا جو چیز قانونی لحاظ سے ایک فریق کا حق ہے، لازم ہے کہ اخلاقی لحاظ سے بھی وہ ہر طرح سے اسی کا حق قرار پائے اور دوسرے فریق کو اس سے بالکل لاتعلق قرار دے دیا جائے۔

ناقدین کے لیے اس بات کا موجب حیرت ہونا خود ہمارے لیے بھی موجب حیرت ہے۔ ہم نے جو بات کہی، وہ عقل عام کے دائرے کی ایک بالکل سادہ سی بات ہے۔ اخلاقی اصولوں کے بارے میں ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ وہ درجے اور اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں، بلکہ متفاوت ہوتے ہیں۔ اخلاقیات کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان کسی معاملے میں صرف اس حق کو پیش نظر رکھے جو اسے بعض عملی پہلوؤں کی بنا پر حاصل ہے اور جس کے تحفظ کی ضمانت اسے 'قانون' دیتا ہے، لیکن اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے حق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کے جذبات و احساسات کو بھی ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور کوئی قانونی جبر نہ ہو تو بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حق میں دوسرے فریق کو شریک کر لے۔

قانون کی غرض اعلیٰ اخلاقیات کے فروغ سے نہیں، بلکہ نزاعات کے تصفیے سے ہوتی ہے۔ اس عملی زاویۂ نگاہ کے باعث بعض دفعہ ایک قانونی فیصلے میں ان بلند تر اور آئیڈیل اخلاقی تصورات کو نظر انداز کرتے ہوئے، جن کی پاس داری ایک فریق کو محض یک طرفہ طور پر (Unilaterally) کرنی چاہیے، اخلاقیات کے اس کم سے کم درجے کو بنیاد بنا لیا جاتا ہے جس کی پابندی پر فریقین کو مجبور کیا جا سکے، اور یہ صورت محض اس لیے اختیار کی جاتی ہے تاکہ کم سے کم عملی الجھنوں کو سلجھانا پڑے۔

یہی صورت حال احاطۂ ہیکل کی تولیت کے معاملے کی ہے۔ مسلمانوں کا یہ موقف کہ چونکہ انھوں نے یہ عبادت گاہ یہود

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے چھینی نہیں تھی ، بلکہ ان کی غیر موجودگی میں اسے آباد کیا تھا اور کئی صدیوں سے وہی اس کی تولیت کے ذمہ دار چلے آ رہے ہیں، یقیناً اخلاقیات کے ایک درجے کے لحاظ سے اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ وہ یہود کو اس کی تولیت کے حق میں اپنے ساتھ شریک نہ کریں، لیکن اخلاقیات کا اس سے ایک برتر درجہ بھی ہے جس کی تعلیم قرآن مجید نے خاص طور پر عبادت گاہوں کے حوالے سے دی ہے، اور وہ یہ کہ خدا کی عبادت چونکہ نیکی اور تقویٰ کا عمل ہے، اس لیے کسی گروہ کو اس کی عبادت گاہ میں جو اس کے روحانی وقلبی جذبات کا مرکز ہے، عبادت کرنے سے نہ روکا جائے ، بالخصوص جب کہ وہاں سے اس کی بے دخلی ظلماً وقہراً اور مذہبی واخلاقی اصولوں کی پامالی کے نتیجے میں عمل میں آئی ہو۔

۱۰۔ صلیبیوں سے مسجد اقصیٰ کی بازیابی

احاطۂ ہیکل کی تولیت کے مسئلے میں ایک غلط فہمی امکانی طور پر سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے طرز عمل سے بھی پیدا ہوسکتی ہے، کیونکہ سلطان نے ۱۱۸۷ء میں فتح بیت المقدس کے بعد اس عبادت گاہ پر نصاریٰ کے قبضے کو ختم کر کے انھیں یہاں سے بے دخل کر دیا تھا۔ سلطان یا ان کے ساتھیوں کا عمل اگرچہ اس معاملے کی شرعی نوعیت کی تعیین میں کسی طرح بھی ماخذ نہیں بن سکتا، تاہم چونکہ ان کا یہ اقدام بذات خود شریعت کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے عین مطابق تھا، اس لیے ہم اس کی صحیح نوعیت کو واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ نصاریٰ کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ مسجد اقصیٰ کی تعظیم وتقدیس اور اس کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ان کا مذہبی نقطۂ نظر یہود سے بالکل مختلف ہے۔ وہ، یہود کے برخلاف، سرے سے اس مقام کی تقدیس وتعظیم کے قائل ہی نہیں اور نہ کبھی اس بنیاد پر انھوں نے اس کی تولیت کا دعویٰ کیا۔ رومی شہنشاہ قسطنطین کی والدہ ملکہ ہیلینا (Helena) نے ۳۳۵ء میں رومی دیوتا 'جیوپیٹر' کے معبد کو گرا کر اس جگہ کو کوڑا کرکٹ اور گندگی پھینکنے کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔[۶۲] ۶۳۸ء میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو فتح کیا تو احاطۂ ہیکل ایک مزبلہ (Garbage Dump) کی صورت میں تھا جہاں نصاریٰ، یہودیوں اور ان کی عبادت گاہ سے نفرت کے اظہار کے لیے کوڑا کرکٹ اور گندگی پھینکا کرتے تھے۔ صلیبی دور میں جب انھوں نے اس جگہ کو اپنے تصرف میں لیا تو بھی اس کا محرک تقدس یا عظمت کا کوئی تصور نہیں تھا، جس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم میں داخل ہونے سے پہلے یہاں کے باشندوں کو ہتھیار ڈالنے کی دعوت دی تو انھوں نے اس سے انکار کرتے ہوئے دھمکی دی کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو پامال کرنے کے لیے تمام عمارتوں کو جلا دیں گے اور قبۃ الصخرۃ کو گرا کر صخرہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔[۶۳] احاطۂ ہیکل کے مسلمانوں کے زیر تصرف آنے کے بعد بھی مسیحیوں کی جانب سے اس عبادت گاہ کی توہین کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ سولھویں صدی میں

۶۲؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ ''قبۃ الصخرۃ'' ۱/۱۶/ ۲۳۳۔

۶۳؎ (Francesco Gabrielli, Arab Historians of the Crusades, p. 157)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سلطان سلیم عثمانی جب یہاں آئے تو احاطۂ ہیکل کی مغربی دیوار یعنی دیوار گریہ کوڑے کرکٹ اور گندگی کے نیچے، جسے نصاریٰ یہاں پھینک دیا کرتے تھے، دبی ہوئی تھی۔ سلطان نے اس جگہ کو صاف کرا کر یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔[۶۴]

اس پس منظر میں دیکھیے تو سلطان صلاح الدین کے صلیبیوں کو احاطۂ ہیکل سے بے دخل کرنے کی بنیاد نصاریٰ کا یہ مخصوص رویہ تھا نہ کہ اہل کتاب کے تعلق و وابستگی کی مطلقاً نفی کا کوئی تصور، اس لیے اس اقدام کو یہود کے معاملے میں، جو اس مقام کی تعظیم و تقدیس کے پوری طرح قائل ہیں، نظری یا عملی طور پر بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

موجودہ حالات میں اس بحث کی ضرورت

اب ہم اس مسئلے سے متعلق ان سوالات کا جائزہ لیں گے جو اس کی عملی نوعیت و اہمیت کے حوالے سے اٹھائے گئے ہیں:

پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ عالم اسلام بالعموم اور عالم عرب بالخصوص، یہود و نصاریٰ کی سیاسی و معاشی چیرہ دستیوں کا شکار ہے اور فلسطینی قوم کی جدوجہد آزادی ایک بے حد نازک موڑ پر ہے، مسجد اقصیٰ کی تولیت کی بحث کو چھیڑنے کی ضرورت اور اس میں ایک ایسا نقطۂ نظر اختیار کرنے کا فائدہ کیا ہے جو ناقدین کے خیال میں، امت مسلمہ کے مفادات کے صریح منافی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس سوال سے تعرض کرتے ہوئے پہلے تو اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو بعض ناقدین کو اس مسئلے کی اہمیت کے حوالے سے لاحق ہوئی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ احاطۂ ہیکل کی تولیت کی بحث ایک مردہ بحث ہے جس کا آج کے عملی حالات سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اس پر زور قلم صرف کرنا ایک بے کار مشغلہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رائے معاصر عالمی مسائل اور حالات سے بالکل بے خبری کی دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بحث پوری طرح سے ایک زندہ بحث ہے اور اسے اگر اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مذہبی تنازع قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ صدیوں کے سکوت کے بعد صہیونی تحریک کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مساعی کے نتیجے میں یہودیوں کے ہاں ہیکل کی تعمیر کا سوال پوری شدت کے ساتھ کھڑا ہو گیا ہے۔ اس سے قبل اس کی حیثیت ایک نظری اعتقاد کی تھی، لیکن قیام اسرائیل اور بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد اس نے ایک عملی مسئلے کا روپ دھار لیا ہے اور یہودی مذہبی حلقوں میں ہیکل کے محل وقوع کی تعیین، اس کی تعمیر کے نقشے، مذہبی و فقہی شرائط اور ممکنہ حکمت عملی پر زور و شور سے بحثیں جاری ہیں۔[۶۵]

۶۴؎ سید ابو الاعلیٰ مودودی، سانحہ مسجد اقصیٰ، ۶۔ Ernest L. Martin: The Strange Story of the False Wailing Wall, http://www.askelm.com/۔

۶۵؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید سلمان حسینی ندوی، 'ہزارۂ سوم کی قیامت صغریٰ' ۴۴۔۷۷۔

یہود کے مذہبی حلقوں میں ہیکل کی تعمیر نو پر اصولی اختلاف تو نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے، البتہ بعض مذہبی شرائط اور معروضی حالات کے تناظر میں یہ حلقے باہم مختلف الرائے ہیں:

۱۔ قدامت پسند یہودی حلقوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تیسرے ہیکل کی تعمیر صرف مسیح کے ہاتھوں ہوگی، اس سے قبل صرف دعا اور انتظار کیا جا سکتا ہے۔ نیز چونکہ سرخ بچھڑے کی غیر موجودگی میں اس وقت یہودی قوم رسمی طور پر ناپاکی کی حالت میں ہے، اس لیے ہیکل کے اصل مقام پر ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ اور چونکہ ہیکل کے اصل مقام کی متعین نشان دہی سر دست نہیں کی جا سکتی، اس لیے احتیاطاً پورے احاطۂ ہیکل میں کسی بھی یہودی کا داخلہ جائز نہیں۔

۲۔ اس کے برعکس بعض انتہا پسند حلقوں کی رائے یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر فوری طور پر روبہ عمل لائی جانی چاہیے، ورنہ کم از کم احاطۂ ہیکل کو یہودیوں کے تصرف میں ضرور دے دیا جانا چاہیے۔

۳۔ یہودیوں کے مذہبی طبقات کا ایک بڑا حصہ اس بات کا قائل ہے کہ ہیکل کی فوری تعمیر کی شرائط تو پوری نہیں ہوتیں، لیکن اس وقت تک یہودیوں کو اس میں دعا اور عبادت کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسرائیل کی ۵۰ فی صد سے زائد رائے عامہ اس نقطۂ نظر کے حق میں ہے اور اسرائیلی عدالتیں متعدد مواقع پر یہودی عبادت گزاروں کو احاطۂ ہیکل میں داخل ہونے اور وہاں دعا کرنے کا حق دے چکی ہیں[۶۶]۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ احاطۂ ہیکل کے ساتھ یہودی قوم کا مذہبی تعلق پوری شدت کے ساتھ قائم ہے۔ تیسرے ہیکل کی تعمیر کی مخالفت کا اظہار اگر ہوتا ہے تو یہودیوں کے مذہب بیزار طبقات اور سیکولر پریس کی جانب سے ہوتا ہے جن کی رائے میں یہ اقدام نہ صرف سنگین سیاسی نتائج کا حامل ہوگا جس سے عرب دنیا اور اسرائیل کے مابین اختلافات کی خلیج مزید بڑھنے کا حقیقی خطرہ موجود ہے، بلکہ وہ قربانی کی مختلف رسوم کو زمانۂ قدیم کی یادگار قرار دیتے ہوئے جدید دور میں انھیں رجعت پسندی اور 'primitivism' کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک مذہبی لوگوں کا تعلق ہے تو تیسرے ہیکل کی تعمیر ان کے اعتقاد کا جزو لاینفک ہے۔ ان میں باہمی اختلاف یہ نہیں کہ ہیکل تعمیر ہوگا یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کیا فی الفور ہیکل کی تعمیر کے لیے مذہبی شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں اور کیا معروضی سیاسی حالات اس کے لیے سازگار ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا اور نزاع بدستور باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ اسرائیلی حکومتیں عالم اسلام کے دباؤ کی وجہ سے داخلی طور پر اس مطالبے کی حوصلہ شکنی کرتی رہی ہیں کہ احاطۂ ہیکل کو یہودیوں کے تصرف میں دے دیا جائے، لیکن اسرائیلی رائے عامہ اور

۶۶۔ Yoel Cohen, "The Political Role of the Israeli Chief Rabbinate in the Temple Mount Question", Jewish Political Studies Review, Vol. 11:1-2, Spring 1999 (www.jcpa.org)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مذہبی حلقوں کے دباؤ پر ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات میں جب بیت المقدس اور اس کے مقامات مقدسہ کی حتمی پوزیشن (Final Status) کا سوال زیر بحث آیا تو اسرائیلی وفد کی جانب سے یہ مطالبہ پورے اصرار کے ساتھ سامنے آیا کہ احاطۂ ہیکل کا زیر زمین حصہ یہودیوں کے زیر تصرف دے دیا جائے اور اس کے ایک کونے میں یہودیوں کے لیے ایک عبادت گاہ قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ (http://www.la.utexas.edu/) ابھی کچھ عرصہ قبل اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون نے ہیکل کی تعمیر کا جو اعلان کیا، اس کا محرک بھی اسرائیلی رائے عامہ کے اسی عنصر کی سیاسی حمایت کا حصول تھا۔

اس وضاحت کے بعد اب ہم اصل سوال کا جائزہ لیں گے، یعنی یہ کہ اس بحث کو ان نازک حالات میں چھیڑنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ ہماری معروضات اس ضمن میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں سب سے نازک سوال امت مسلمہ کی اخلاقی پوزیشن کا ہے۔ ہم نے اپنی تحریر میں رائج نقطہ ہائے نظر کے علمی پہلوؤں پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاقی مضمرات کو بھی پوری طرح واضح کیا تھا اور یہ گزارش کی تھی کہ امت مسلمہ کے سیاسی اور معاشرتی وجود کی بامقصد بقا کے لیے سب سے پہلے اس کے اخلاقی وجود کا تحفظ ضروری ہے۔ اگر امت کسی معاملے میں اجتماعی طور پر ایک غیر اخلاقی رویہ اختیار کیے ہوئے ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے جس کی اصلاح کی کوشش باقی تمام کوششوں سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ گزارش کسی بھی درجے میں درخور اعتنا نہیں سمجھی گئی اور معاملے کو اس زاویے سے دیکھنے کے بجائے اسے قومی مفادات ہی کی عینک سے دیکھنے کو ترجیح دی گئی ہے۔ کسی قوم کو داخلی احتساب پر آمادہ کرنا ویسے بھی کوئی آسان کام نہیں، لیکن اس کے ساتھ جب اجتماعی نفسیات میں یہ غرہ بھی ہو کہ ہم تو خدا کی آخری شریعت کے حامل اور افضل الرسل کی امت ہیں، جبکہ ہمارا مخالف گروہ ایک مغضوب وملعون گروہ ہے تو عدل وانصاف اور غیر جانب داری کی دعوت، فی الواقع، کوئی آسانی سے ہضم ہونے والی چیز نہیں رہ جاتی۔ اس کا اندازہ، زیر بحث مسئلے میں، اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے کسی ناقد نے عالم عرب کے اس موقف کی تردید کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جس کی رو سے مسلمانوں کے زیر تصرف 'الحرم الشریف' کا سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ 'ہیکل' سے، جس کا ذکر قرآن مجید نے 'المسجد الاقصیٰ' کے نام سے کیا ہے، کوئی تعلق نہیں اور 'مزعومہ ہیکل' ماضی میں کبھی بھی اس احاطے کے اندر کسی جگہ واقع نہیں تھا۔ یہ دعویٰ تاریخی و مذہبی مسلمات کی کھلم کھلا تکذیب پر مبنی ہے، اور اگر امت مسلمہ کے 'مفادات' کے پیش نظر اس سے بھی 'غض بصر' کیا جا سکتا ہے تو پھر ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے بعد 'اخلاقی حس' کا کون سا درجہ باقی رہ جاتا ہے جسے اپیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا معاملہ محض ایک مذہبی اور اخلاقی معاملہ نہیں، اس کا مسئلۂ فلسطین کے سیاسی پہلو کے ساتھ بھی نہایت گہرا عملی تعلق ہے۔ قیام اسرائیل ان بے شمار جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیوں میں سے ایک ہے جو عالم اسلام کے طول و

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عرض میں یورپی طاقتوں کے غلبہ واستیلا کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں معمولی نوعیت کی نہیں تھیں۔انھوں نے عالم اسلام کے پورے سیاسی نقشے کوتلپٹ کر کے رکھ دیا۔اس غلبے کے نتیجے میں عالم اسلام،جس کا بیش تر حصہ وقت کی دو عظیم سلطنتوں یعنی خلافت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کے زیر سایہ سیاسی لحاظ سے متحد تھا،ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ان میں سے سلطنت مغلیہ کے بیش تر رقبے پر اس وقت ایک بہت بڑی غیر مسلم ریاست قائم ہے،جبکہ سلطنت عثمانیہ کے زیادہ تر یورپی مقبوضات 'عالم اسلام' سے نکل کر غیر مسلم دنیا کا حصہ بن چکے ہیں۔وسطی ایشیا کا مسلم اکثریت پر مشتمل خطہ عرصہ دراز تک ایک غیر مسلم سپر پاور کا حصہ بنا رہا۔خود باقی ماندہ عالم اسلام میں لسانی،نسلی،مذہبی،سماجی اور معاشی بنیادوں پر کثیر الجہات تبدیلیوں کا جو غیر مختتم سلسلہ شروع ہوا،وہ اس پر مستزاد ہے۔اس سے کئی صدیاں قبل یورپ کی انھی طاقتوں کے ہاتھوں اندلس کی عظیم الشان مسلم سلطنت کی تباہی کا زخم ہم سہہ چکے ہیں۔

سیاسی ومعاشی مغلوبیت کا یہ مظہر دراصل قاضی تقدیر کی مقرر کردہ وہ سزا ہے جو جرم ضعیفی کی مرتکب ہر قوم کو،بلا استثنا،اس دنیا میں مل کر رہتی ہے۔یہ سزا جب نافذ ہوتی ہے تو کسی قوم کے لیے عظمت رفتہ کے خوابوں میں جینا ممکن نہیں رہتا۔کوئی قوم اگر اس کے بعد ماضی میں جینا چاہتی ہے تو وہ اپنی سزا کی مدت میں محض اضافہ ہی کرتی ہے۔اس کے بعد فیصلوں اور حکمت عملی کی درست بنیاد کی حیثیت معروضی حقائق کو حاصل ہو جاتی ہے نہ کہ خواہشات،امنگوں اور ماضی کے تاریخی حقائق کو۔چنانچہ سیاست اور جغرافیہ میں رونما ہونے والی مذکورہ تمام تبدیلیوں کو،جو ظاہر ہے کہ یورپی طاقتوں کی جانب سے قانونی اور اخلاقی قدروں کی پامالی ہی کے نتیجے میں رونما ہوئی تھیں،عالم اسلام نے 'معروضی حقائق' کی منطق کی رو سے قبول کر لیا اور آج وہ کسی قسم کے موثر بہ ماضی مطالبات اور قانونی ونظری سوالات اٹھائے بغیر وضع موجود (Status-quo) ہی کے تناظر میں ان سب طاقتوں کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com

فلسطین کا معاملہ بھی معروضی حالات کے اس جبر سے مستثنیٰ نہیں،اور صیہونیت سے قطع نظر کر لیجیے تو عرب ممالک اسی خطے میں زمینی حقائق کے ادراک کا عملی ثبوت بھی دے چکے ہیں،چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں عربوں نے ترکوں کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس شرط پر برطانوی حکومت کا ساتھ دیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر ترکی کے تمام عرب مقبوضات کو ایک یا ایک سے زائد آزاد اور خود مختار عرب مملکتوں کی حیثیت دے دی جائے گی۔تاہم برطانوی حکومت نے فرانس کے ساتھ اپنے ایک خفیہ معاہدہ (Sykes-Picot Agreement) کے تحت،جس سے عربوں کو قصداً بے خبر رکھا گیا تھا،[۶۷] جنگ کے اختتام پر فلسطین کا کنٹرول خود سنبھال لیا اور ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز نے فلسطین کو باقاعدہ برطانوی انتداب کے سپرد کر دیا۔ برطانوی حکومت کی اس دوغلی پالیسی کے باوجود اس کے بعد ۱۹۴۸ء تک برطانوی انتداب ہی کو قانونی اتھارٹی تسلیم کرتے

---

۶۷ مفتی عبدالقیوم قادری،تاریخ نجد وحجاز ۳۵۹۔۳۶۰ بحوالہ ''دی سیکرٹ لارنس آف عریبیہ'' از فلپ نائٹلی / کولن سمپسن۔

ہوئے خطے کے تمام عرب ملک اس کے ساتھ معاملات کرتے رہے۔ سلطنت برطانیہ کے ساتھ کیے جانے والے قانونی و سیاسی معاہدوں کی پاس داری کا حال یہ تھا کہ ۱۹۳۸ء میں جب حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک خفیہ رپورٹ کی بنیاد پر، جس میں بتایا گیا تھا کہ سعودی حکومت فلسطین کے انقلاب پسندوں کے ساتھ مالی تعاون کرنے کے علاوہ یورپ سے اسلحہ خرید کر انھیں مہیا کر رہی ہے، سعودی حکمران شاہ عبدالعزیز سے جواب طلبی کی گئی تو انھوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

''ہمارے مابین ایک سچی دوستی اور مشترک مفادات کے حوالے سے کئی معاہدات موجود ہیں۔ ہمیں اس کا پورا یقین ہے کہ عربوں کے موجودہ اور مستقبل کے مفادات کو محفوظ بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے برطانیہ کے ساتھ دوستی اختیار کر لیں۔ اگر اہل فلسطین میری بات مانتے تو برطانیہ سے اپنے مطالبات تسلیم کرانے کے لیے پرامن ذرائع کو ہی واحد حکمت عملی کے طور پر اختیار کرتے۔ حکومت برطانیہ کے علم میں اس بات کا آنا ضروری ہے کہ فلسطینی انقلاب کے لیے ہماری مدد کے حصول کے لیے بہت سی کوششیں کی گئیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم کوئی ایسا اقدام کریں جس سے ہمارے اور برطانیہ کے مابین معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔'' (جیران شامیۃ: 'آل سعود، ماضیہم و مستقبلہم'، ۲۱۲)

جہاں تک معروضی حقائق کا تعلق ہے تو وہ صہیونی ریاست کے معاملے میں دنیا کے کسی بھی دوسرے سیاسی معاملے سے بڑھ کر واضح اور نمایاں ہیں۔ عربوں کے مقابلے میں یہودیوں کی ذہنی، تعلیمی، معاشی، سیاسی اور تدبیری فوقیت مسلم اور اپنے مشن کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی اور اس کے حصول کے لیے جانی و مالی قربانی کا جذبہ عدیم المثال ہے۔ اس کے ساتھ انھیں برطانیہ، روس اور امریکہ جیسی عالمی طاقتوں کی پشت پناہی بھی آغاز ہی سے واضح طور پر حاصل رہی ہے۔ یورپ میں صدیوں تک یہودی جس مذہبی اور معاشرتی ایذا رسانی (Persecution) کا نشانہ بنے رہے، اس کی بنا پر ہمدردی کی ایک عمومی فضا مغربی دنیا میں ان کے لیے پائی جاتی ہے اور اپنی غیر معمولی تدبیری کوششوں سے انھوں نے عالمی آئینی اداروں سے بھی ریاست اسرائیل کو فی نفسہٖ ایک جائز اور قانونی ریاست تسلیم کرا رکھا ہے۔ ریاست اسرائیل دنیا کے نقشے پر ان گوناگوں عوامل کے نتیجے میں، عربوں کی تمام تر مزاحمت کے باوجود، ظہور پزیر ہوئی اور جب تک ان عوامل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، اس کا وجود باقی رہے گا۔ ان حالات میں صہیونی ریاست کے عملاً قائم ہو جانے کے بعد اسی حکمت عملی کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا جسے عالم اسلام کے طول و عرض، بلکہ خود فلسطین میں حالات کے جبر کے تحت اختیار کیا گیا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معروضیت اور عملیت پسندی کا یہ رویہ قیام اسرائیل کے حوالے سے یک سر غائب ہے۔ عرب ممالک اور عوام ایک عرصے تک تو طاقت کے توازن میں فرق کو ہی سمجھنے میں ناکام رہے، چنانچہ قیام اسرائیل کے بعد مسلسل ربع صدی تک اسرائیل کے ساتھ عسکری مخاصمت کے راستے پر چل کر ہر جنگ میں پہلے سے زیادہ رقبے سے ہاتھ دھونے اور لاکھوں فلسطینیوں کو گھر سے بے گھر کرانے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ پھر جب نصف صدی کے تجربات اردگرد کے عرب ملکوں اور فلسطین کی سیاسی قیادت کو زمینی حقائق سے کچھ آشنا کر دینے میں کامیاب ہوئے تو جہادی تنظیمیں اپنے خودکش حملوں کے ساتھ یہ بتانے کے لیے آن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موجود ہوئیں کہ انھیں منزل سے نہیں، صرف سفر سے غرض ہے۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں فلسطینی قوم اپنے کسی ہدف کو پانے میں تو کامیاب نہیں ہوسکی، البتہ اس کے مسائل ومشکلات میں ہر گزرنے والے مرحلے کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اب اگر اسرائیل کے حوالے سے عرب دنیا کی اس جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ حکمت عملی کے نفسیاتی اسباب تلاش کیجیے تو 'مسجد اقصیٰ' کا معاملہ ان میں سرفہرست ہوگا۔ یہ حکمت عملی جس نفسیاتی فضا میں اختیار کی گئی، اس کی تشکیل میں اس تصور کا کردار غیر معمولی ہے کہ مسجد اقصیٰ صرف اور صرف مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ ہے اور اس خطے میں یہودیوں کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لینے کے بعد اس عبادت گاہ سے ان کو دور رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی حرمت کے فتوے کی بنیاد بھی اصلاً اسی مسئلے پر ہے۔ یہی مسئلہ عرب اور مسلم دنیا میں اس مذہبی جذباتیت کے فروغ کا سبب ہے جس کی بنیاد پر صدام اور ناصر جیسے قوم پرست اور سیکولر ڈکٹیٹروں کو صلاح الدین ایوبی جیسے عالی مرتبت جرنیل کے ساتھ تشبیہ دینا گوارا کیا گیا۔ امت مسلمہ کی یہی وہ 'دکھتی رگ' ہے جس کو چھیڑ کر ایریل شیرون جیسے امن دشمن یہودی اپنے سیاسی مفادات کی خاطر فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کے مابین جاری امن مذاکرات کے سارے عمل کو برباد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور آج بھی اس خطے میں پائدار امن کے قیام میں جو مسائل بنیادی رکاوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں یروشلم اور اس کے مقامات مقدسہ کی تولیت کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ معروضی حالات کا ادراک کرنے کی صلاحیت پر یہ جذباتی مسئلہ کس درجے میں اثر انداز ہوا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو مولانا مودودی کا تجویز کردہ یہ ''سیدھا اور صاف حل'' ملاحظہ فرمالیجیے:

> ''یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہوسکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہوسکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفر سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے، صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں، باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں، انھیں واپس جانا چاہیے۔'' (سانحہ مسجد اقصیٰ ۹۱۔۲۰)

اسرائیل کے حوالے سے اس خاص امتیازی رویے کا جواز ثابت کرنے کے لیے پیش کی جانے والی دوسری توجیہات (Justifications)، مثلاً صہیونی حکما کے نام نہاد پروٹوکولز یا عظیم تر اسرائیل کا منصوبہ، زیادہ تر زیب داستاں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بالفرض ان چیزوں کی کوئی واقعی حقیقت ہو بھی تو وہ اسرائیل کے ساتھ سیاسی سطح پر معاملہ کرنے میں مانع نہیں، کیونکہ اسرائیل اس مفروضہ ریاست کے قیام کے لیے اندھا دھند پیش قدمی کرنے کی پوزیشن میں بہرحال نہیں ہے، چنانچہ وہ اس مفروضہ عظیم تر ریاست کے بعض علاقوں پر قابض ہونے کے بعد عملی مصلحتوں کے پیش نظر صحرائے سینا مصر کو اور بعض مقبوضہ علاقے لبنان کو واپس کر چکا ہے، گولان کی پہاڑیاں بعض تحفظات کے ساتھ شام کو واپس کرنے کے لیے تیار ہے اور مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں آزاد فلسطینی ریاست کے قیام پر اصولی آمادگی ظاہر کر چکا ہے۔ خود عرب دنیا اسرائیل کے مبینہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

توسیع پسندانہ عزائم کے باوجود عملاً اسرائیل کے ساتھ پرامن تعلقات کے قیام کی ضرورت کا احساس کر چکی ہے۔ مصر اور اردن کب سے اس کے وجود کو جائز تسلیم کر چکے ہیں۔ سعودی عرب، لبنان اور شام ہمسایہ عرب ملکوں کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی اور فلسطینیوں کی آزاد ریاست کے قیام کی شرط پر اسرائیل کو تسلیم کرنے کا عندیہ ظاہر کر چکے ہیں[۶۸]۔ فلسطین کی سیاسی لیڈر شپ عسکریت کا راستہ ترک کر کے گزشتہ ایک دہائی سے اسرائیلی حکومتوں کے ساتھ مذاکرات اور معاہدوں کا ڈول ڈالے ہوئے ہے۔ اور تو اور، حماس کے سپریم لیڈر شیخ احمد یاسین نے شہادت سے قبل متعدد مواقع پر یہ اعلان کیا کہ اسرائیل اگر مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں فلسطینیوں کی آزاد ریاست کو تسلیم کر لے تو حماس قیام امن کے عمل میں تعاون کرے گی۔ روزنامہ جنگ لاہور میں ۲۷ جنوری ۲۰۰۴ کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق:

''حماس کے سرکردہ رہنما عبدالعزیز رانتیسی نے اپنی خفیہ کمین گاہ سے ٹیلی فونک انٹرویو میں کہا کہ اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد قبضے میں لیے گئے فلسطینی علاقے خالی کر دے تو حماس دس سالہ جنگ بندی پر تیار ہے۔ تنظیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ موجودہ صورت حال میں ہم اپنی سرزمین کے پورے علاقے کو آزاد نہیں کرا سکتے لہٰذا فی الحال ہم مغربی کنارے، جس میں یروشلم اور غزہ کی پٹی بھی شامل ہو، پر مشتمل فلسطینی ریاست قبول کر لیں گے اور اسرائیل کے مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے انخلا اور فلسطینی ریاست کے قیام کی صورت میں فائر بندی قبول کر لیں گے۔ حماس کے رہنما نے بتایا کہ اس پیشکش کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حماس اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لے گی یا اس سے اسرائیل فلسطینی جھگڑا ختم ہو جائے گا۔''

گویا 'بعد از خرابی بسیار' تمام متعلقہ فریق ان زمینی حقائق کو تسلیم کرنے اور ان کی بنیاد پر اسرائیل کے ساتھ معاملہ کرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں جن کے واقعی ادراک سے، دیگر بہت سے عوامل کے ساتھ ساتھ، احاطۂ ہیکل کے بارے میں یہ تصور بھی نفسیاتی طور پر مانع ہے کہ یہودی اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اب اگر یہ تصور کوئی شرعی اور دینی بنیاد نہیں رکھتا تو کیا یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ معاملہ کی اصل حقیقت لوگوں کے سامنے لائی جائے اور ان بے بنیاد تصورات کی اصلاح کی کوشش کی جائے جو معروضی حقائق کو تسلیم کرنے اور کوئی نتیجہ رخی (Result-oriented) حکمت عملی اختیار کرنے کے حوالے سے امت مسلمہ، بالخصوص عالم عرب کو یک سو نہیں ہونے دے رہے؟

---

۶۸ سعودی وزیر خارجہ سعود الفیصل نے سعودی عرب کے مجوزہ امن منصوبے کی معنویت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ''نئی اور اہم بات یہ ہے کہ اب اسرائیل دفعۃً واحدۃ (in one shot) پورے عالم عرب کے ساتھ پرامن تعلقات قائم کر سکتا ہے۔'' ان سے پوچھا گیا کہ کیا عالم عرب اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے فی الواقع تیار ہے تو انھوں نے کہا: ''اگر وہ جنگ کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں تو ہم بالکل تیار ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہودیوں سے ہماری کیا دشمنی ہے؟ وہ بھی ہماری دنیا کا ایک حصہ ہیں۔'' پوچھا گیا کہ یہ تصور کرنا کچھ مشکل سا نہیں ہے کہ ریاض میں اسرائیلی سفارت خانہ قائم ہو؟ تو انھوں نے کہا: ''اگر سعودی عرب میں اسرائیلی اور اسرائیل میں سعودی سفارت خانہ قائم ہو تو دو ملکوں کے مابین تعلقات کی صورت میں یہ تو ہوتا ہی ہے۔'' (Weekly Time, April 8, 2002, 32)

۳۔ اس مسئلے کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے جو ہمارے لیے اس بحث کو ان نازک حالات میں چھیڑنے کا محرک بنا ہے۔ امت مسلمہ کی منصبی ذمہ داری، جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں تفصیل سے بیان ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں اقوام عالم تک دین ابراہیمی کا ابلاغ ہے۔ جہاں تک جزیرۂ عرب اور اس کے گردونواح کے علاقوں کا تعلق ہے، یہ ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے 'اتمام حجت' کے درجے میں انجام دی۔ اس اتمام حجت میں دو عوامل تو تکوینی لحاظ سے، عالم اسباب میں، معاون بنے: ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۂ عرب کے جن اہل کتاب کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا، وہ سرزمین عرب کے اندر مقیم ہونے کی وجہ سے اپنے مذہبی صحائف کی پیش گوئیوں اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایات سے پوری طرح واقف اور ان کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے منتظر تھے۔ دوسرے یہ کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت اور اس کے مختلف مراحل کو بتمام وکمال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا اور غلبۂ اسلام کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اس کی تکمیل خود ان کے سامنے ہوئی۔ ان تکوینی عوامل کے علاوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں تدبیری لحاظ سے بھی ایسی حکمت عملی اختیار فرمائی کہ اہل کتاب میں مسلمانوں کے ساتھ قرب واشتراک کا احساس پیدا ہو اور انبیاے بنی اسرائیل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مابین اتحاد اور یگانگت کے پہلو اجاگر ہو جائیں۔ چنانچہ:

o آپ نے اپنی دعوت کے لیے مشترک اساس ملت ابراہیمی کو قرار دیا اور اہل کتاب کے سامنے یہ بات مختلف پہلوؤں سے نمایاں کی کہ آپ کسی نئے دین کے داعی نہیں، بلکہ دین ابراہیمی کی انھی تعلیمات کے احیا کے لیے تشریف لائے ہیں جو اہل کتاب اور اہل اسلام کے لیے مشترک طور پر ماخذ ومصدر کی حیثیت رکھتی ہیں۔[۶۹]

o مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اہل کتاب کو اپنی دعوت کا مخاطب بنانے میں حکمت اور موعظہ حسنہ سے کام لیں اور اگر کہیں بحث مباحثہ کی ضرورت پیش آ جائے تو تہذیب اور شایستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔[۷۰]

o اسی ضمن میں انھیں یہ ہدایت بھی دی گئی کہ وہ اہل کتاب کی علمی ومذہبی خیانتوں سے محض ضرورت کی حد تک تعرض کریں اور اس کو مجادلہ ومباحثہ کا مستقل موضوع بنا کر ایک نفسیاتی وذہنی بعد پیدا کرنے کے بجائے ان کی اس قسم کی باتوں سے درگزر اور اعراض سے کام لیں۔[۷۱]

o مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی کہ وہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے پراپیگنڈا، بے ہودہ اعتراضات، گستاخی وبے ادبی اور زبانی اذیت کی دیگر ناگوار صورتوں کو حتی الامکان صبر اور تقویٰ کے ساتھ برداشت کریں۔[۷۲] رسول اللہ صلی

۶۹؎ آل عمران ۳: ۶۴۔ العنکبوت ۲۹: ۴۶۔

۷۰؎ النحل ۱۶: ۱۲۵۔ العنکبوت ۲۹: ۴۶۔

۷۱؎ المائدہ ۵: ۱۳۔

اللہ علیہ وسلم نے اسی دعوتی حکمت عملی کے تحت یہود کے ناقابل برداشت حد تک گستاخانہ رویے پر بھی عام طور پر صبر و اعراض اور عفو و درگزر ہی سے کام لیا۔[۷۳]

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حوالوں سے اہل کتاب کے ساتھ موافقت و موانست اور دعوت و مکالمہ پر مبنی ایک نہایت پرامن، مثبت اور موافقانہ فضا قائم کی، جس کی ایک جھلک ذیل کے چند واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے:

o مکی عہد نبوت میں جب روم کے مسیحیوں اور فارس کے مجوسیوں کے مابین جنگ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمان بہت غمگین ہوئے۔ رومیوں کے ساتھ اس ہمدردی کو قرآن مجید نے بنظر استحسان دیکھا اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ وعدہ فرمایا کہ عنقریب رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوگا اور اس دن مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔[۷۴]

o ہجرت کے بعد ایک مخصوص عرصے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی تالیف قلب کے لیے ان کے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔[۷۵]

o فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کی خوشی میں مدینہ منورہ کے یہود محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت میں عاشورا کا روزہ رکھنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا۔[۷۶]

o ایک انصاری نے یہ جملہ زبان سے ادا کرنے پر ایک یہودی کو تھپڑ مار دیا کہ: 'والذی اصطفی موسیٰ علی البشر' (اس اللہ کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کی ہے) اور کہا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل قرار دیتے ہو؟ یہودی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس کی شکایت سن کر انصاری سے شدید ناراض ہوئے اور یہود کے مذہبی جذبات کی رعایت سے صحابہ کو اس بات سے منع فرما دیا کہ وہ ان کے سامنے انبیا میں سے بعض کو بعض سے افضل قرار دیں۔[۷۷]

o ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے

۷۲؎ البقرہ: ۱۰۴۔ آل عمران، ۱۸۶۔

۷۳؎ بخاری، استتابۃ المرتدین، ۶۴۱۴۔ ایضاً، الہبۃ، ۲۴۲۴۔ مسلم، السلام، ۴۰۵۹۔ ترمذی، البیوع، ۱۱۳۴۔

۷۴؎ الروم: ۱۔۵۔

۷۵؎ البقرہ: ۱۴۳۔

۷۶؎ بخاری، الصوم، ۱۸۶۵۔

۷۷؎ بخاری، احادیث الانبیاء، ۳۱۶۲۔

انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عصر کی نماز کا وقت آیا اور انھوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ نے ان کو روک دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انھیں نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ انھوں نے مشرق کی سمت میں اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔[۷۸]

o ایک شخص کا جنازہ گزرا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو فرمایا: کیا وہ انسان نہیں ہے؟[۷۹]

o رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان کے ساتھ معاشرتی اور قانونی معاملات میں ہر موقع پر عدل و انصاف کا رویہ اختیار فرمایا جس کی شہادت ایک موقع پر خود یہود نے یوں دی کہ: 'ھذا الحق و بہ تقوم السماء و الارض'[۸۰]، ''یہی وہ حق اور انصاف ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں۔''

o جن معاملات میں آپ کو کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ہوتی تھی، ان میں آپ اہل کتاب کے قوانین اور طریقوں کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔[۸۱]

o لباس اور وضع قطع سے متعلق امور میں بھی آپ مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب کے طریقے کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔[۸۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تدبیری کوششوں کی وجہ سے اہل کتاب کو تعصّبات اور نفسیاتی الجھنوں سے صاف ماحول میں پوری ذہنی آزادی کے ساتھ آپ کی دعوت کو سمجھنے کا موقع ملا اور آپ کے دعواے نبوت کی حقانیت ان پر پوری طرح واضح ہو گئی، چنانچہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں،[۸۳] البتہ وہ آپ کو صرف بنی اسماعیل کا نبی قرار دیتے ہوئے خود کو آپ پر ایمان لانے کے حکم سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔[۸۴] یہ اعتقاد عہد نبوی اور عہد صحابہ کے اہل کتاب تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان علاقوں میں آباد ان کی آیندہ نسلیں بھی بالعموم اسی کی قائل رہیں۔[۸۵]

۷۸۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱۰۸/۴۔

۷۹۔ بخاری، الجنائز، ۱۲۲۹۔

۸۰۔ ابوداؤد، البیوع، ۲۹۶۱۔

۸۱۔ مسلم، الحدود، ۳۲۱۲۔ طحاوی، شرح معانی الآثار ۳۱۵/۱۔

۸۲۔ بخاری، اللباس، ۵۴۶۲۔

۸۳۔ البقرہ: ۷۶۔

۸۴۔ البقرہ: ۹۱۔

۸۵۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱۵۱/۱، ۱۵۲۔ ابواللیث السمرقندی، فتاویٰ النوازل ۲۰۸۔ ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ ۶۲۶/۲۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوتی حکمت عملی کی اتباع، جس کے نتیجے میں دعوت حق کے مذکورہ نتائج حاصل ہوئے، زمان ومکان کی تبدیلیوں سے قطع نظر امت مسلمہ کے لیے ہر ماحول اور ہر زمانے میں ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ شہادت حق کی ذمہ داری ادا کی جا سکتی ہے اور نہ دعوت وتبلیغ سے ان نتائج کے حاصل ہونے کی کوئی توقع ہی کی جا سکتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو اپنے زمانے میں حاصل ہوئے، لیکن اسے ایک بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ مغربی یورپ اور اس کے زیر اثر دوسرے علاقوں کے باشندوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا عمل اس طرح کے موافق اور سازگار ماحول میں شروع نہ کیا جا سکا۔ اس خطے کی مسیحی طاقتوں سے مسلمانوں کا پہلا واسطہ صلیبی جنگوں میں پڑا اور ایک صدی پر محیط ان خوں ریز جنگوں کی تلخ یادیں صدیوں کے لیے فریقین کے ذہنوں پر نقش ہو گئیں۔ یورپ کے عوام کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی جو بھیانک اور مسخ شدہ تصویر قرون وسطیٰ میں پیش کی جاتی رہی، اس کے پس منظر میں جہالت، تعصب، جذبۂ تحقیق کے فقدان اور عدم رواداری کے ساتھ ساتھ صلیبی جنگوں کی پیدا کردہ نفسیاتی فضا بھی پوری طرح کارفرما تھی۔ یہ تاریخ کا ایک جبر تھا، تاہم اس کا ازالہ تاریخ کے ایک دوسرے جبر کے ذریعے سے ممکن ہوا۔ علم وفکر پر اہل مذہب کی عائد کردہ غیر فطری پابندیوں سے جب اہل مغرب کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انھوں نے مذہب کو ایک جوا قرار دے کر اس کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ ریاست کی طرف سے ایک مخصوص مذہب کو اختیار کرنے کی پابندی کا خاتمہ کر دیا گیا اور اپنی رائے اور ضمیر کے مطابق کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے کا حق ہر فرد کا بنیادی انسانی حق قرار پایا۔ آج مغرب اپنے تاریخی تجربات کی روشنی میں جس اخلاقی قدر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور جس پر وہ گویا 'ایمان' لائے ہوئے ہے، وہ یہی مذہبی آزادی، رواداری اور باہمی احترام کی قدر ہے۔ یورپ میں مذہب اور ریاست کی علیحدگی کم از کم اس حوالے سے اپنے اندر خیر کا ایک نمایاں پہلو رکھتی ہے کہ اس نے مذہب اور ریاست دونوں کو ایک دوسرے کی مجبوریوں سے چھٹکارا دلا دیا۔ ریاست، کلیسا کے مذہبی تعصّبات سے بلند ہو کر لوگوں کی فلاح وبہبود پر توجہ دینے کے قابل ہوئی، اور اہل مذہب کی چشم تنگ انسانی زندگی کی بلند تر آدرشوں اور وسیع تر مقاصد کے ادراک کے لیے وا ہو گئی۔ مستثنیات سے صرف نظر کر لیجیے تو آج یورپ میں مذہب اور ریاست، دونوں اس بنیادی قدر پر متفق ہیں۔ اس ضمن میں کاتھولک کلیسا کا انقلاب حال خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اس کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ گزشتہ صدیوں میں روا رکھا جانے والا رویہ بھی سامنے رکھیے اور ویٹیکن کی مجلس دوم[۸۶] کا یہ اعلان بھی ملاحظہ فرمائیے:

''کلیسا اہل اسلام کو بھی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ تو اس واحد خدا کی تعظیم کرتے ہیں جو انسان سے ہم کلام ہوا۔ یہ اسے واجب الحی اور واجب الوجود، رحمان ورحیم، قادر مطلق، آسمان اور زمین کا خالق تسلیم کرتے ہیں اور دیانت داری کے ساتھ اس کے وہ احکام عمل میں لاتے ہیں جو محض بشری فہم وادراک سے بالکل باہر ہیں۔ اس بات میں یہ حضرت ابراہیم کی سی

۸۶۔ ۱۹۶۲۔۱۹۶۵۔

اطاعت پیش کرتے ہیں جس سے اہل اسلام اپنے ایمان کے مطابق تعلق رکھتے ہیں۔ اہل اسلام اگرچہ خداوند یسوع کی الوہیت سے منکر ہیں تاہم اسے نبی کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ یسوع کی کنواری ماں کا بھی احترام کرتے ہیں اور اکثر عقیدت مندانہ طور پر اسے یاد کرتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ وہ یوم قضا کے بھی منتظر ہیں جب خدا تمام بنی نوع انسان کو مردوں سے زندہ کر کے ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔ آخر کار یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ وہ اخلاقی زندگی کی قدر کرتے ہیں اور خصوصاً نماز، زکوٰۃ اور روزوں سے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ چونکہ گزشتہ صدیوں کے دوران میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ وجدل اور عداوت برپا ہوتی رہی، اس لیے یہ مقدس مجلس سب کو یہ ترغیب دیتی ہے کہ ماضی کو بھول کر مخلصانہ طور پر ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور کل بنی آدم کے فائدے کے لیے معاشرتی انصاف، اخلاقی بھلائی، سلامتی اور آزادی کو محفوظ رکھیں اور ترقی دیں۔'' (ویٹی کن مجلس دوم، مترجم: حمید ہنری ۵۶۲)

صلیبی جنگوں کی تلخ یادوں کو مغرب کی نفسیات سے مٹانے اور اسلام کی اصل دعوت کو ایک کھلے اور آزاد ماحول میں اہل مغرب تک پہنچانے کے حوالے سے یہ انقلاب حال یقیناً ایک 'خوش قسمتی' قرار پاتا، لیکن بدقسمتی یہاں اس طرح آڑے آئی کہ جب تعصب اور جہالت کے خلاف خود یورپ نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اس میں ادیان و مذاہب سمیت انسانی علم کے دائرے میں آنے والی ہر چیز کی آزادانہ تحقیق کا جذبہ پیدا ہوا تو مسلمان یورپی طاقتوں کے ہاتھوں اپنی سیاسی اور معاشی مغلوبیت کے غم میں مبتلا ہو کر اپنے دعوتی کردار سے غافل ہو چکے تھے۔ چنانچہ یورپ کے ذہنی اور فکری انقلاب نے دعوت اسلام کے حوالے سے جو امکانات پیدا کیے، مسلمان ان کو کسی بھی قابل ذکر درجے میں استعمال نہ کر سکے۔ یہ فضا اسلام کی دعوت کے فروغ کے لیے جس قدر ضروری اور مفید تھی، مسلمانوں نے اتنا ہی اس کی ناقدری کا ثبوت دیا۔ اور اب تو سیاسی اور معاشی محرومیوں کا احساس اتنا غالب آ چکا ہے کہ ہماری حکمت عملی میں نہ 'دعوت اسلام' کو کوئی مقام حاصل ہے اور نہ اپنے اقدامات اور پالیسیوں کا ہم اس زاویے سے جائزہ لینے کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی دعوت پر وہ کس طرح سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ مغربی دنیا علمی، فکری اور سماجی سطح پر مذہبی رواداری کے حوالے سے جس قدر حساس ہوتی جا رہی ہے، مسلمانوں کی طرف سے اس قدر کی پامالی داخلی اور خارجی، دونوں دائروں میں اتنی ہی شدت کے ساتھ سامنے آ رہی ہے۔ حقیقت چاہے کچھ ہو، لیکن آج لگتا یہ ہے کہ مذہبی رواداری اصل میں مغرب کی قدر ہے، اس لیے کہ مسلمان عالمی سطح پر اپنے دین کا تعارف جس صورت میں پیش کر رہے ہیں، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، یہودی اور مسیحی عبادت گاہوں پر خودکش حملے، ہیکل سلیمانی کے بارے میں تاریخی مسلمات کی تکذیب اور نہایت کمزور دلائل کی بنیاد پر یہودیوں کے تاریخی و مذہبی حق کی نفی اس کے نمایاں مظاہر ہیں۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس صورت حال کا تجزیہ تاریخی تناظر میں جو بھی کیا جائے اور اس کا ذمہ دار جن اسباب و عوامل کو بھی ٹھہرایا جائے، یہ بات طے شدہ ہے کہ اسلام کو اپنی اصل صورت میں مغربی اقوام تک پہنچانے کی ذمہ داری ان نفسیاتی اور ذہنی رکاوٹوں کو دور کیے بغیر پوری نہیں کی جا سکتی جن کو کھڑا کرنے میں خود ہماری کوتاہ نظری کا حصہ کم نہیں ہے۔ یہ اقوام مسیحیت کی پیروکار ہیں جو صدیوں سے دنیا کا سب سے بڑا مذہب چلا آ رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی کے مطابق قیامت کے برپا ہونے کے وقت بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہوگی۔[۸۷] گویا مغرب کی یہ مسیحی اقوام دعوت اسلام کا سب سے بڑا ہدف ہیں اور ان تک اس پیغام کو پہنچانے کے لیے مذہبی اساسات میں اشتراک کو اجاگر کرنا اور امن اور بھائی چارے کی فضا کا قیام آج بھی دعوت اسلام کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو احاطۂ ہیکل کے تنازع کا ایک منصفانہ اور معقول حل مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے تشدد، جارحیت اور عدم رواداری کے منفی تاثر کے ازالے اور دعوت اسلام کے حوالے سے مثبت اور سازگار فضا کی تشکیل میں غیر معمولی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر امت مسلمہ کی قیادت سطحی جذباتیت سے بالاتر ہو کر اپنی بصیرت اور فراست کو بروے کار لاتے ہوئے دنیا کا یہ سنگین ترین مذہبی تنازع حل کر سکے تو دعوت اسلام کے اس قدر لامحدود مواقع اور امکانات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان کا پیشگی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کا انتظار کیے بغیر جب خارجی حالات کا دباؤ اس مسئلے کا کوئی ممکنہ طور پر ناپسندیدہ حل قبول کرنے پر ہمیں مجبور کر دے، یہ پیش کش خود امت مسلمہ کی جانب سے ایک بلند اخلاقی شعور اور داعیانہ بصیرت کے ساتھ سامنے آئے اور اس کے نتیجے میں دعوت اسلام کے لیے تیار ہونے والی (Responsive) فضا سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی حکمت عملی پیشگی وضع کر لی گئی ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیا کوئی عملی حل ممکن ہے؟

اب ہم اس بحث کے آخری نکتے کی طرف آتے ہیں۔ اوپر کی ساری بحث سے یہ سوال قدرتی طور پر سامنے آتا ہے کہ کیا اس تنازع کا کوئی قابل قبول عملی حل ممکن بھی ہے، اور کیا کوئی ایسی صورت نکالی جا سکتی ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کو اس عبادت گاہ سے بالکلیہ لاتعلق اور اس میں عبادت کے حق سے محروم کیے بغیر دونوں کے حق تولیت و عبادت کے لیے گنجایش پیدا کی جا سکے؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ اس مقام کی تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

احاطۂ ہیکل (Temple Mount)، جو کہ آج کل 'الحرم الشریف' کے نام سے معروف ہے، بحالت موجودہ تقریباً پینتالیس ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے۔ سطح سمندر سے یہ احاطہ اوسطاً ۲۴۰۰ فٹ بلند ہے اور اس کو ایک غیر متساوی الاضلاع چار

۸۷؎ مسلم، الفتن و اشراط الساعۃ، ۵۱۵۸۔

دیواری محیط ہے۔ جنوبی جانب سے اس دیوار کی لمبائی تقریباً ۹۱۰، شمالی جانب سے تقریباً ۱۰۲۵، مشرقی جانب سے تقریباً ۱۵۲۰ اور مغربی جانب سے تقریباً ۱۵۸۰ فٹ ہے۔ اسی احاطے کے اندر کسی مقام پر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے وہ شان دار عبادت گاہ تعمیر کی تھی جو تاریخ میں 'ہیکل سلیمانی' کے نام سے معروف ہوئی۔ 'ہیکل' کی اصل عمارت کی بنیادیں، اس کی تعمیر کا نقشہ اور حدود اسرائیلی شریعت میں بالکل متعین تھیں اور ان میں کمی بیشی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں تھا، چنانچہ ۵۸۶ ق م میں بخت نصر کے ہاتھوں تباہی کے بعد دوسرے ہیکل کی تعمیر بھی انھی بنیادوں پر ہوئی اور یہودی مذہبی قوانین کے مطابق تیسرا ہیکل بھی بعینہٖ انھی بنیادوں پر تعمیر ہوگا۔ البتہ 'مسجد' کی اصل عمارت کے اردگرد نسبتاً وسیع تر رقبے میں ایک چار دیواری بھی تعمیر کی گئی تھی جسے بعد میں دو مرحلوں پر مزید وسیع کر دیا گیا۔ پہلی مرتبہ یہ توسیع یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس نے ۱۹ ق م میں، جبکہ دوسری مرتبہ رومی شہنشاہ ہیڈرین نے ۱۳۶ء میں کی۔ ہیڈرین کی مقرر کردہ چار دیواری ہی آج تک برقرار چلی آ رہی ہے۔

۶۳۸ء میں سیدنا عمر کی زیر قیادت بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے اس احاطے میں نصاریٰ کے پھینکے ہوئے کوڑا کرکٹ اور گندگی کو صاف کرا کر اس کی جنوبی دیوار کے قریب ایک جگہ کو اپنی عبادت کا مرکز بنا لیا اور بعد میں وہاں ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی گئی۔ ابتدا میں کچھ عرصہ تک یہ 'مسجد عمر' کے نام سے معروف رہی،[۸۸] لیکن چونکہ ہیکل کے پورے احاطے میں مسلمانوں نے صرف یہی جگہ نماز کے لیے مخصوص کر لی تھی، اس لیے مسلمانوں کے ہاں 'مسجد اقصیٰ' کا لفظ اپنے اصل مفہوم یعنی ہیکل سلیمانی اور اس کو محیط پوری چار دیواری کے بجائے رفتہ رفتہ اسی مخصوص مسجد کے لیے بولا جانے لگا۔ عبد الملک بن مروان نے اپنے دور حکومت میں احاطے کے تقریباً وسط میں واقع صخرۂ بیت المقدس پر بھی ایک قبہ تعمیر کرا دیا۔ یہی دو عمارتیں آج بھی احاطے کے اندر اہم اور نمایاں ہیں۔ عبد الملک کی پیروی میں بعد کے مسلمانوں نے بھی مختلف اوقات میں یہاں مختلف جگہوں پر چھوٹے بڑے قبے تعمیر کر لیے جنھیں مختلف ناموں سے موسوم کر دیا گیا۔

اس وقت عملی صورت حال کے لحاظ سے یہ پورا احاطہ صدیوں سے مسلمانوں کے زیر تصرف ہے اور اس تسلسل کی بنیاد پر یروشلم کے مسلم وقف کا موقف یہ ہے کہ اس احاطے کی ایک انچ جگہ پر بھی یہودی کوئی حق نہیں رکھتے اور اس کے کسی بھی حصے پر ان کو تولیت و تصرف کا حق دینا احکام شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ مفتی اعظم فلسطین علکرمہ صبری کے الفاظ میں:

> ''مسجد اقصیٰ کے اردگرد تمام عمارتیں اسلامی وقف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان عمارتوں کے دروازے، کھڑکیاں اور راستے براہ راست مسجد اقصیٰ کی جانب کھلتے ہیں اور برکت اور تقدس کے لحاظ سے ان کا درجہ بھی وہی ہے جو کہ مسجد اقصیٰ کا۔ لہٰذا اسلامی قانون کی رو سے ان میں سے کسی بھی عمارت کو غصب کر کے اسے یہودیوں کی عبادت گاہ میں تبدیل کرنا ناممکن ہے۔'' (http://www.la.utexas.edu/)

ہمارے نزدیک موجودہ نزاع کی اصل جڑ مسلم وقف کا یہی انتہا پسندانہ موقف ہے، اور اس پر نظر ثانی نہ صرف قرآن

۸۸؎ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۷/۵۶۔

وسنت کے نصوص، بلکہ امت مسلمہ کے اس رویے کی روشنی میں بھی ضروری ہے جو اس نے گزشتہ صدیوں میں، احاطۂ ہیکل پر عملاً قابض ہونے کے باوجود، ہیکل کی تعمیر کے امکان کے حوالے سے اختیار کیے رکھا۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ایک وقت آئے گا جب وہ اس مقام پر 'ہیکل سلیمانی' کی تعمیر نو کریں گے۔ اس امکان کے حوالے سے امت مسلمہ کے ردعمل کا تاریخی لحاظ سے جائزہ لیجیے تو وہ منفی نہیں، بلکہ مثبت رہا ہے:

۱۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر سیدنا عمر کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے عبادت کی ایک ایسی جگہ منتخب کی جو ہیکل کی اصل عمارت سے بالکل ہٹ کر واقع تھی۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مستقبل میں یہود اور مسلمانوں کے مابین کسی تنازع کے پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

۲۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اگرچہ بعض سیاسی یا مذہبی اغراض کے تحت سیدنا عمر کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہوئے احاطۂ ہیکل کے اندر اس چٹان کے اوپر بھی ایک گنبد تعمیر کرا دیا جسے مسلم مفسرین کی تصریح کے مطابق یہود کے قبلہ کی حیثیت حاصل ہے اور جہاں یہودی روایات کے مطابق ہیکل سلیمانی کا مقدس ترین مقام (Holy of holies) واقع تھا، تاہم یہ کوئی مسجد نہیں، بلکہ محض ایک زیارت گاہ تھی[۸۹]۔ عبدالملک کا یہ اقدام اگرچہ عملاً ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کا بنیادی سبب ہے جن سے آج ہمیں سابقہ پیش آ رہا ہے، تاہم خود اس کے ذہن میں پورے احاطۂ ہیکل سے اہل کتاب کے حق کی بالکلیہ نفی کا کوئی تصور نہیں تھا، چنانچہ اس نے قبۃ الصخرۃ کی تعمیر اور اس کے انتظام وانصرام میں یہودیوں کو بھی شریک ہونے کا موقع دیا۔ اردن یونیورسٹی میں تاریخ یروشلم کے محقق ڈاکٹر کامل جمیل العسلی اور 'Encyclopaedia Judaica' کے مقالہ نگار بتاتے ہیں کہ ساتویں صدی میں مسجد اقصیٰ کو آباد کرنے کے بعد مسلمانوں نے مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو بھی یہاں بطور مجاور خدمت انجام دینے کا موقع فراہم کیا[۹۰]۔

پندرہویں صدی کے عرب مورخ قاضی القضاۃ مجیر الدین الحنبلی[۹۱] نے اپنی کتاب ''الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل'' میں اس کی حسب ذیل تفصیل نقل کی ہے:

> ''مسجد اقصیٰ کے لیے دس یہودی خادم مقرر کیے گئے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اگلی نسلوں میں ان کی تعداد بڑھ کر بیس ہوگئی۔ ان کے ذمے گرمی سردی کے موسم اور زیارت کے ایام میں مسجد اور اس کے اردگرد طہارت خانوں کے کوڑا کرکٹ کو

---

۸۹ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مقالہ: 'Dome of the Rock'، ۱۶۳/۴۔ منشی عبدالقدیر، بیت المقدس ۱۸۸۔

۹۰ (Dr. Kamil Jamil Al-Asalai, "Jerusalem in History", Arab Studies Quarterly, Vol. 16 Number 4, Fall 1994, (www.al-bushra.org)- Encyclopaedia Judaica, "Jerusalem", vol. 9, p. 1410)

۹۱ ۱۴۹۶ء۔

www.javedahmadghamidi.com

صاف کرنا تھا۔ اسی طرح دس مسیحی خاندانوں کو نسل در نسل مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ مسجد کے لیے چٹائیاں تیار کرنے کے علاوہ ان چٹائیوں اور اس نالی کی صفائی کرتے تھے جس سے گزر کر پانی حوضوں تک آتا تھا۔ دیگر کاموں کے علاوہ پانی کے حوضوں کی صفائی بھی انھی کے ذمے تھی۔ مسجد کے یہودی خادموں کی ایک جماعت شیشے کے چراغ، پیالے اور فانوس وغیرہ تیار کرتی تھی اور ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اسی طرح وہ خادم بھی جزیہ سے مستثنیٰ تھے جنھیں چراغوں کی بتیوں کی دیکھ بھال پر مامور کیا گیا تھا۔ ان کو یہ ذمہ داری عبد الملک کے زمانے سے لے کر ہمیشہ کے لیے نسل در نسل سونپ دی گئی تھی۔'' (۲۸۱)

۳۔ صخرہ کی تعظیم وتکریم کے حوالے سے عبد الملک کے اس اقدام کو اکابر اہل علم نے قرآن وسنت اور سلف کے طریقے سے صریحاً متجاوز قرار دیا اور اس پر کڑی تنقید کی۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نہ سیدنا عمر نے صخرہ کے قریب نماز پڑھی اور نہ مسلمانوں نے، اور نہ انھوں نے اس کو چھونے یا بوسہ دینے کا طریقہ ہی اپنایا۔ عبد اللہ ابن عمر کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ جب بیت المقدس میں آتے تو مسجد اقصیٰ میں آ کر نماز ادا کرتے تھے، لیکن صخرہ یا دوسرے مقامات کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ یہی طریقہ سلف میں سے عمر بن عبد العزیز، اوزاعی اور سفیان ثوری جیسے معتمد اہل علم سے مروی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کا صرف وہ حصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جسے سیدنا عمر نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص کیا۔ اس کے علاوہ باقی کسی حصے کو دوسرے حصے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں... صخرہ تو اصل میں یہود کا قبلہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس کو (محض ایک محدود وقت کے لیے) قبلہ مقرر کیا گیا تھا، لیکن پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا، چنانچہ ہماری شریعت میں جیسے ہفتے کے دن کے بارے میں (جس کی یہود تعظیم کرتے ہیں) کوئی خصوصی حکم نہیں، اسی طرح صخرہ کے حوالے سے بھی کوئی خصوصی حکم باقی نہیں رہا۔ اس کی تعظیم کا طریقہ یہود کی مشابہت اختیار کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔'' (اقتضاء الصراط المستقیم ۴۳۴۔۴۳۵)

۴۔ مسلمانوں کا سلسلۂ عبادت پوری تاریخ میں اصلاً سیدنا عمر کے مخصوص کردہ اسی حصے تک محدود رہا ہے جہاں اس وقت 'مسجد اقصیٰ' قائم ہے، اور اسی حصے کو وہ بلا شرکت غیرے صرف مسلمانوں کا حق سمجھتے رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یروشلم کا سفر کرنے والے متعدد سیاحوں اور زائرین کے بیانات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے یہودیوں کو احاطۂ ہیکل میں آنے جانے اور ہیکل کے اصل محل وقوع کے قریب دعا اور عبادت کرنے کی اجازت حاصل تھی اور صرف مسجد عمر یعنی موجودہ مسجد اقصیٰ میں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔[92]

خلافت عثمانیہ کے دور میں بعض سیاسی وجوہ کے تحت احاطۂ ہیکل میں یہود ونصاریٰ کے داخل ہونے پر پابندی عائد کی گئی، لیکن انیسویں صدی میں جب سلطنت عثمانیہ اور یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مابین صلح وامن کے تعلقات قائم ہوئے تو ۱۸۵۶ء میں ترکوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کے احاطۂ ہیکل میں آنے جانے پر عائد اس پابندی کو منسوخ کر کے سابقہ اجازت کی

---

۹۲ تفصیل کے لیے دیکھیے: جیوش انسائیکلوپیڈیا، مقالہ ''یروشلم''۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

باقاعدہ تجدید کر دی۔[93]

۵۔ فقہی ذخیرے میں کہیں بھی مسجد اقصیٰ کے ساتھ یہود کے تعلق اور اس پر ان کے حق کی نفی نہیں کی گئی، بلکہ فقہاے احناف نے، اس کے برخلاف، اپنی کتابوں میں باقاعدہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مسجد اقصیٰ کا معاملہ مسلمانوں کی عام مساجد سے مختلف ہے، چنانچہ عام مساجد کے لیے وہ اہل ذمہ کے وقف یا وصیت کردہ مال کو قبول نہیں کرتے، کیونکہ ان کی حیثیت خالصتاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی ہے، لیکن مسجد اقصیٰ کے حوالے سے وہ اہل کتاب کا یہ حق پوری طرح تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اس کی تعمیر وتزئین اور اس کے انتظامات کے لیے اپنا مال وقف یا وصیت کریں۔[94] اس کا مفہوم، ظاہر ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس کو خالصتاً اہل اسلام کی نہیں، بلکہ اہل اسلام اور اہل کتاب، دونوں کی مشترکہ عبادت گاہ مانتے اور اس پر اہل کتاب کا مذہبی حق تسلیم کرتے ہیں۔

۶۔ اس عقیدے کا اظہار کرنے والے یہودیوں کے خلاف کسی قسم کے مواخذہ یا محاسبہ کا کوئی تذکرہ ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس مثالیں ملتی ہیں۔ قرون وسطیٰ کے مشہور یہودی عالم اور فلسفی موسیٰ بن میمون نے اپنی کتاب 'The Code of Jewish Law' میں صاف طور پر لکھا تھا کہ فقہی شرائط کے پورا ہونے پر 'ہیکل سلیمانی' کی تعمیر یہودیوں کی ہر نسل کے لیے ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔[95] اس کے باوجود انھیں سلطان صلاح الدین ایوبی کے دربار میں ان کے ذاتی معالج اور دوست کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل تھا اور انھی کے اثر ورسوخ کے تحت سلطان نے بعض یہودی خاندانوں کو یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت دی تھی۔[96]

مذکورہ تاریخی شواہد اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ بیت المقدس اور اس کے مقامات مقدسہ سے، جن میں احاطۂ ہیکل بھی شامل ہے، یہود ونصاریٰ کو روکنے کی کوشش یا حق تولیت وعبادت کے تناظر میں ان پر کوئی پابندی پوری اسلامی تاریخ میں، چند استثنائی صورتوں کے سوا، کبھی عائد نہیں کی گئی۔ یہ بات اس تناظر میں خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حجاز مقدس کو، جس میں مسجد حرام واقع ہے، غیر مسلموں کے قیام کے لیے شرعاً ایک ممنوعہ علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ دونوں مقامات کے حوالے سے ان متباین رویوں کا زیر بحث نکتے کے ساتھ تعلق اتنا واضح ہے کہ خود یہود کے حق تولیت کی تنسیخ کے قائل اہل علم بھی اس کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ مولانا قاری محمد طیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جزیرۂ عرب سے یہود ونصاریٰ کے اخراج کی بنیاد نہ تعصب ہے نہ جانب داری اور نہ قومی انفرادیت، بلکہ صرف اس حرم

۹۳۔ منشی عبدالقدیر، بیت المقدس ۹۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ ''القدس'' ۱/۱۶/ ۳۰۸۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا، مقالہ ''یروشلم''۔

۹۴۔ ابن نجیم، البحر الرائق ۸/ ۴۵۵۔ ابن الہمام، فتح القدیر ۶/ ۲۰۱۔ ابن عابدین، ردالمحتار ۴/ ۳۴۱۔ فتاویٰ عالمگیری ۶/ ۱۴۴۔

۹۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، سانحہ مسجد اقصیٰ ۵۔

۹۶۔ پندرہ روزہ تعمیر حیات، ۱۰ جون ۲۰۰۳، ۲۱۔ http://www.rabbiwein.com/۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الٰہی کو عالمی بدامنی سے بچانا تھا جس کو تشریعاً وتکویناً 'ھدی للعالمین' اور 'قیاما للناس' اور 'حرما آمنا' کہہ کر عالمی امن گاہ اور عالمی ہدایت گاہ بنایا گیا تھا، کیونکہ قدرتی طور پر جو عالمی امن گاہ ہوگی، اس کی بدامنی بھی عالمی ہی ہوگی نہ کہ مقامی۔ اندریں صورت اگر اس مرکز امن میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین وغیرہ مختلف قوموں کی مخلوط آبادی رکھی جاتی تو قدرتی طور پر مذہبی تعصّبات اور فرقہ وارانہ کشیدگیوں کا پیدا ہونا وہاں بھی ناممکن نہ ہوتا... دوسرے کسی وقت بھی بالخصوص قومیتوں کے فروغ کے وقت، جیسا کہ آج کا دور ہے، مشرکین زور پکڑ کر یہ آواز بھی اٹھا سکتے تھے کہ چونکہ کعبہ محترمہ قومی طور پر ان کا ہے اور وہ پشت ہا پشت سے بت پرستی ہی کا مذہب لیے ہوتے تھے، لہٰذا کعبہ میں اگر مسلمان نماز پڑھیں تو اسی میں ان کی مورتیاں بھی رکھوادی جائیں جن کی وہ بھی پوجا پاٹ کرتے رہیں... تو نتیجہ یہ ہوتا کہ جس گھر کی وضع ہی توحید عبادت اور ردشرک کے لیے ہوئی تھی، اسی سے اشراک عبادت اور ردتوحید کے دھارے بہنے لگتے۔'' (مقامات مقدسہ ۵۹۳)

''جہاں بیت المقدس سابق میں مسلمانوں کا قبلہ اول اور بعد میں موضع صلوٰۃ وجاے ہجرت رہتا آ رہا ہے، وہیں وہ یہود ونصاریٰ کا بھی قبلہ اور مذہبی مرکز ہے اور اس لیے شام میں مسلمانوں کی طرح ان دونوں قوموں کی آمد ورفت اور قلبی دواعی سے ان کا قیام ومقام بھی طبعاً ضروری تھا جس سے روک دیا جانا اسلام نے باوجود اپنی قدرت واقتدار کے کبھی گوارا نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اس رکاوٹ کو اپنا حق سمجھا، بلکہ ہمیشہ ان قوموں کو وہاں آنے جانے کی آزادی دیے رکھی جو آج تک بھی قائم ہے۔'' (۶۲۳)

''مسلمانوں نے اپنے قبضہ کے دور میں بلاشائبہ تعصب مسجد اقصیٰ، بیت اللحم، صخرۂ معلقہ اور طور سینا کی اسی طرح عظمت وتقدیس اور حفاظت کی جس طرح انھوں نے کعبہ مقدسہ کو عظمتوں کا گھر یقین کر کے اس کی تقدیس کی، جس سے یہود ونصاریٰ کی کبھی بھی دل شکنی نہیں ہوئی، بلکہ ان دونوں قوموں کے لیے اقصیٰ وطور کے دروازے اسی طرح بفراخ دلی کھولے رکھے جس طرح خود ان کے لیے وہ کھلے ہوئے تھے۔'' (۷۱۱)

سوال یہ ہے کہ جس امکان کے پیش نظر حجاز مقدس میں یہود ونصاریٰ کے قیام کو ممنوع قرار دیا گیا، وہی امکان مسجد اقصیٰ کے بارے میں یہود کے باقاعدہ اور علانیہ مذہبی عقیدے کی صورت میں امت مسلمہ کے سامنے موجود تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود امت مسلمہ نہ صرف اس شہر، بلکہ اس عبادت گاہ کے ساتھ ان کے تعلق ووابستگی کو بنظر احترام دیکھتی اور یہاں ان کو آزادانہ آنے جانے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیتی رہی؟

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قبۃ الصخرہ سمیت پورے احاطۂ ہیکل کو سیدنا سلیمان علیہ السلام کی مسجد کا حصہ ہونے کے تعلق سے ایک عمومی تقدس اور احترام کا مرتبہ تو یقیناً حاصل ہے، لیکن موجودہ 'مسجد اقصیٰ' کے علاوہ پورے احاطۂ ہیکل پر تولیت وتصرف کا حق جتانے اور یہودیوں کے حق کی کلیتاً نفی کرنے کا دینی وتاریخی لحاظ سے نہ کوئی جواز ہے اور نہ ضرورت۔ ہمارے نزدیک یہی وہ نکتہ ہے جو اس تنازع میں ایک قابل عمل حل کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لیے کہ اس کو مان لینے کی صورت میں مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ اس عبادت گاہ کے حوالے سے یہود کے زاویۂ نگاہ سے قطعی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مختلف قرار پاتا ہے۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے، ان کی دلچسپی بعینہٖ ان بنیادوں پر تیسرے ہیکل کی تعمیر سے ہے جن پر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے پہلا ہیکل تعمیر فرمایا تھا۔ ہیکل کی تباہی کو صدیاں گزر جانے کے بعد اس کی چار دیواری میں توسیع اور متعدد بار تعمیرات کے نتیجے میں ہیکل کی اصل بنیادوں کی متعین طور پر نشان دہی تو زیر زمین کھدائی اور اثریاتی تحقیق (Archaelogical Research) کے بغیر ممکن نہیں، تاہم بائیبل اور تالمود میں بیان کردہ تفصیلات کی روشنی میں یہودی علما نے تخمیناً اس کی تعیین کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں ان کے ہاں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

پہلے نقطۂ نظر کے مطابق، جسے 'روایتی نقطۂ نظر' کہا جاتا ہے اور جسے یہودی علما اور ربیوں کے ہاں اب تک قبول عام حاصل ہے، ہیکل سلیمانی عین اس مقام پر یا اس سے نہایت قریب واقع تھا جہاں اس وقت قبۃ الصخرہ موجود ہے۔ صخرہ درحقیقت قربان گاہ کا پتھر ہے جہاں سوختنی قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ بیش تر یہودی ماہرین آثار قدیمہ بھی اسی نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ تاہم بعض نئی تحقیقات میں روایتی نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے اختیار کی گئی ہے کہ ہیکل عین قبۃ الصخرہ کے بجائے اس سے کچھ ہٹ کر واقع تھا۔ اس ضمن میں دو رائیں ہیں:

یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کے راکاہ (Racah) انسٹی ٹیوٹ آف فزکس کے پروفیسر آشر کوف مین (Physicist Asher Kaufman) کی تحقیق کے مطابق ہیکل کا مقدس ترین مقام یعنی قدس الاقداس (Holy of Holies) قبۃ الصخرہ کی شمالی جانب میں قبۃ الروح (Dome of the Spirits) کے اندر موجود پتھر کی جگہ واقع تھا۔ یہ جگہ قبۃ الصخرہ کے شمال میں ۱۱۰ میٹر یعنی ۳۳۰ فٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس ضمن میں تل ابیب کے ایک ممتاز ماہر تعمیر توویا ساگیو (Tuvia Sagiv) کی رائے کے مطابق ہیکل کا محل وقوع قبۃ الصخرہ کی جنوبی جانب میں تھا۔ یہ جگہ قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کے درمیان تقریباً وسط میں ہے اور اس وقت یہاں فوارۂ کاس (Al Ka's fountain) واقع ہے[۹۷]۔

یہود کے نقطۂ نگاہ کے برعکس مسلمانوں کا اصل مذہبی مقصد احاطۂ ہیکل کی تولیت یا ہیکل کی اصل بنیادوں پر مسجد کی تعمیر نہیں، بلکہ اس مقدس مقام پر محض عبادت کا حق حاصل کرنا ہے، چنانچہ تورات میں بیان کردہ ہیکل کے مخصوص نقشے اور اس کی متعین بنیادوں کو اسرائیلی شریعت کے احکام کے حوالے سے جو بھی اہمیت حاصل ہو، اسلامی نقطۂ نگاہ سے عظمت و تقدس اور عبادت پر اجر و ثواب ملنے کے پہلو سے یہ پورا احاطہ یکساں فضیلت رکھتا ہے، بلکہ اس میں اگر مزید توسیع بھی کر لی جائے تو اجر و ثواب کی نوعیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس مقام پر نماز ادا

---

۹۷ تفصیل کے لیے دیکھیے: Labmert Dolphin & Michael Kollen, "On the Location of the First and Second Temples in Jerusalem", (http://ldolphin.org/)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کرنے کا ذکر ملتا ہے، وہ ہیکل کی چار دیواری کے اندر، لیکن 'ہیکل' کی اصل عمارت سے باہر واقع ہے۔ ۶۳۸ء میں فتح بیت المقدس کے بعد مسلمانوں نے بھی ہیکل کی اصل بنیادوں سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی ظاہر کیے بغیر سیدنا عمر کی پیروی میں اسی مقام پر نماز ادا کرنا شروع کر دی اور بعد میں وہاں ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی گئی۔ یہی مسجد، آج 'مسجد اقصیٰ' کہلاتی ہے، اور یہودی ماہرین کے تجویز کردہ مذکورہ تینوں مقامات میں سے جس مقام کو بھی ہیکل کا اصل محل وقوع مانا جائے، موجودہ مسجد اقصیٰ اس کی زد میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ربی شلوموگورن جیسے انتہا پسند یہودی رہنما نے بھی، جس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیلی فوج کے کمانڈر سے قبۃ الصخرہ کو ڈائنامائیٹ سے اڑا دینے کا مطالبہ کیا تھا، وزارتی کمیٹی برائے مقامات مقدسہ (Ministerial Committee for Holy Places) کو بھیجی جانے والی یادداشت میں یہ تجویز پیش کہ قبۃ الصخرۃ کا ایریا تو مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دیا جائے، لیکن مسجد اقصیٰ چونکہ ہیکل کی اصل عمارت کے اندر شامل نہیں، اس لیے وہاں مسلمانوں کو رسائی کی اجازت دے دینی چاہیے۔[۹۸]

گویا موجودہ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے حق تولیت کو محفوظ رکھتے ہوئے احاطۂ ہیکل کے تنازع کا ایک معقول حل موجود ہے۔ یہ حل یہودی مذہبی حلقوں کے لیے تو بدیہی طور پر قابل قبول ہے، البتہ مسلمانوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان بے بنیاد مذہبی تصورات کو خیر باد کہنا ہوگا جو پوری عبادت گاہ سے یہود کے حق تولیت کی تنسیخ یا قبۃ الصخرۃ کی اہمیت و تقدس کے حوالے سے وضع کر لیے گئے ہیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی اتباع میں اپنے حق کو اس جگہ تک محدود ماننا ہوگا جہاں روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا تذکرہ ملتا ہے اور جسے سیدنا عمر نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔ ھذا ما عندی و العلم عند اللّٰہ۔

---

۹۸ Yoel Cohen, "The Political Role of the Israeli Chief Rabbinate in the Temple Mount Question", Jewish Political Studies Review, Vol. 11:1-2, Spring 1999 (www.jcpa.org)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org